محرم الحرام، صفر المظفر
علم کا ذوق، عمل کا شوق بڑھانے والا بچوں کا رسالہ
ستمبر 2021

ماہ نامہ ذوق و شوق کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Jamia-Uloom-Islamiyyah
(University of Islamic Sciences)
Allama Muhammad Yousuf Banuri Town
Karachi - Pakistan.

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ
علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن
کراچی ۷۴۸۰۰ - پاکستان

Ref. No. _____ Date. _____

باسمہ تعالیٰ

از: حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب دامت برکاتہم

محترم اساتذہ کرام، ائمہ مساجد، ذمہ داران مدارس ومکاتب اور پرنسپل حضرات

طلبہ وطالبات کی تربیت کے لیے چند گزارشات

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بچوں کی اچھی تعلیم وتربیت ہمارا اسلامی وقومی فریضہ ہے۔ بچے ملک وقوم کے معمار اور معاشرے کا حسن ہوتے ہیں۔

اگر انھیں صحیح تعلیم وتربیت دی جائے تو اس سے ایک مضبوط اور مثالی معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ کیوں کہ انھی بچوں میں سے پڑھ لکھ کر کوئی ڈاکٹر بنتا ہے، کوئی انجینئر، کوئی عالم دین، کوئی افسر، کوئی تاجر، کوئی قانون دان، کوئی سیاست دان تو کوئی صحافی، الغرض زندگی کے مختلف شعبوں سے وابستہ ہوکر وہ ملک وقوم کی خدمت میں حصہ لیتے ہیں۔

بچوں کی تعلیمی وتربیتی ترقی کے لیے آپ ۴ کام پابندی سے فرمائیں تو ایک کامیاب معاشرے کے وجود میں آپ کا ضرور حصہ ہوگا:

۱۔ آپ بچوں کے لیے خوب دعائیں مانگیں، ان پر خوب محنت کریں، ان کے بول چال پر نظر رکھیں۔ سچائی، امانت داری، ایثار، والدین کی اطاعت، بڑوں کا ادب، پڑوسیوں کا خیال، چھوٹوں پر شفقت اور ہر کام کو محنت ولگن سے صحیح طریقے سے کرنے کا بار بار درس دیں۔ یہ صفات بچوں کی زندگی میں آجائیں اس کے لیے "تربیتی نصاب" کے نام سے ایک نصاب تیار کیا گیا ہے۔

۲۔ بچوں کی ذہنی صلاحیت کو مدنظر رکھتے ہوئے انبیائے کرام علیہم السلام، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، تابعین وتبع تابعین رحمہم اللہ اور بزرگان دین کے حالات اور واقعات کو مختلف مثالوں اور کہانیوں کے ذریعے ان کے سامنے بیان کریں۔ ساتھ ہی عملی پہلوؤں کی الگ سے نشان دہی بھی کریں۔ اس کے علاوہ "صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے واقعات" اور "تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ کے واقعات" نامی کتابوں سے بچوں کو پڑھ کر سنائیں اور ان کو مطالعہ کرنے کی ترغیب دیں۔

۳۔ بچوں کو اردو زبان میں اچھے مواد پر مشتمل دینی رسائل وجرائد کے پڑھنے اور ان میں لکھنے کا عادی بنائیں۔ جس سے انھیں زبان وبیان کے ساتھ عمدہ تحریر پر قدرت حاصل ہوگی۔ پھر جب وہ عملی میدان میں جائیں گے تو آنی والی نسلوں کے سامنے اپنی بات اچھے انداز میں پیش کرسکیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

الحمد للہ! اسی سوچ کو سامنے رکھتے ہوئے "جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن" "وفاق المدارس العربیہ پاکستان" کے فضلاء اور "اسکولوں کے اساتذہ کرام" کی زیر نگرانی بچوں کا ماہ نامہ "ذوق وشوق" شائع ہورہا ہے۔ ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ جس میں بچوں کو اساتذہ کرام اور والدین کے ادب، اسکول ومدرسے کی پابندی، پان گٹکا اور بری صحبت سے بچنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ میں اسے اللہ تعالیٰ کا خاص فضل سمجھتے ہوئے شکر بھی ادا کرتا ہوں۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي بِنِعْمَتِهٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ

۴۔ اسکولوں میں بچوں کی تربیت کے لیے "پانچ منٹ کا مدرسہ" ایک کتاب تیار کی جارہی ہے۔ اگر اسمبلی میں روزانہ ۵ منٹ بچوں کو کتاب پڑھ کر سنا دی جائے تو بہت فائدہ ہوگا۔ ائمہ مساجد اور بنات کے مدارس کے مہتممین سے بھی یہی گزارش ہے کہ وہ اس کتاب کو طالبات اور مقتدیوں کو بعد فجر یا عصر مناسب ہو تو سنائیں۔

آپ حضرات سے گزارش ہے کہ خود بھی اس کا مطالعہ کریں اور اپنے گھر، خاندان، اسکول، مکاتب اور مدارس کے بچوں کو اس کے پڑھنے کی خوب ترغیب دیں۔ تاکہ ہماری نسل کتاب دوست بنے۔ مساجد سے ملحق چھوٹی سی لائبریری بنائیں، نوجوانوں کو مطالعے کا شوق دلوائیں۔

میں امید کرتا ہوں کہ آپ میری اس گزارش پر عمل کرکے معاشرے کی اصلاح میں اپنا کردار ضرور ادا کریں گے۔

اللہ تعالیٰ آپ حضرات کی قدم قدم پر مدد فرمائے اور آپ حضرات کو ہمیشہ سرسبز وشاداب رکھے۔ آمین

والسلام

عبدالرزاق اسکندر

۱۴۴۰/۱/۲

P.O. Box: 3465 Karachi Code No. 74800, Phone: (0092-21) - 34913570 - 34912683 - 34915966 - 34123366 - 34121152
Fax: (0092-21) - 34919531, Karachi Pakistan. URL: www.banuri.edu.pk , E-mail: info@banuri.edu.pk

پیغامِ الٰہی جل جلالہ

عبدالعزیز

(مفہوم آیت :93، از سورہ بقرہ)

”اور (اے یہودیو!) وہ زمانہ یاد کرو جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا تھا اور (یہ قول وقرار لینے کے لیے) تمھارے اوپر طور پہاڑ بلند کیا تھا (اور اُس وقت یہ حکم دیا تھا کہ) ہم تمھیں جو کچھ (حکم) دیتے ہیں (اسے) ہمت (اور مضبوطی) کے ساتھ لے لو اور (ان حکموں کو دل سے) سنو، (اس وقت) ان یہودیوں نے (ڈر کے مارے زبان سے تو) کہہ دیا کہ ہم نے (قبول کیا اور) سن لیا اور (چوں کہ حقیقت میں یہ بات دل سے نہیں مانی تھی، اس لیے گویا اپنے حال سے یوں بھی کہہ رہے تھے کہ) ہم سے عمل نہ ہوگا اور (اس بددلی کی وجہ یہ تھی کہ) ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں میں وہی بچھڑا پیوست ہوگیا تھا۔ آپ فرما دیجیے کہ یہ باتیں تو بہت بُری ہیں، جن کا حکم تمھارا ایمان تمھیں کر رہا ہے اگر تم (اپنے گمان کے مطابق اب بھی) ایمان والے ہو۔“

عزیز دوستو! اس سے پہلے بھی آیت نمبر 63 میں یہ بات آچکی ہے کہ یہودیوں سے توریت پر عمل کرنے کا پختہ وعدہ لینے کے لیے طور پہاڑ کو اُن کے اوپر اٹھایا گیا تھا، یہاں اس بات کو دوبارہ دہرایا گیا ہے۔ انھوں نے پہاڑ کے اپنے اوپر گرنے کے ڈر سے اس وقت اگرچہ توریت کے احکام پر عمل کرنے کا وعدہ تو کرلیا تھا، لیکن بعد میں اپنے اس وعدے سے پھر گئے اور نافرمانی پر تل گئے اور کہنے لگے کہ ہم نے سنا تو ہے، مگر عمل کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔

ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں میں بچھڑے کی عبادت کرنا رچ بس گیا تھا اور رگ وپے میں اتر گیا تھا، جیسا کہ پینے کی کوئی چیز جسم کے اندر جا کر جہاں جہاں ہوسکے جگہ پکڑ لیتی ہے، لہٰذا اُنھوں نے وعدہ پورا نہ کیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ السلام کے ذریعے انھیں کہلوایا کہ تم لوگ اگر ایمان کا دعویٰ کرتے ہو تو یہ تمھارا کیسا ایمان ہے جو تمھیں کفر اور شرک جیسے بُرے عمل پر آمادہ کرتا ہے، نبی آخر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جھوٹا سمجھنے پر ابھارتا ہے، لہٰذا در حقیقت تم ایمان والے ہو ہی نہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں یہودیوں کی ان بُری صفات، یعنی اقرار کرکے مکر جانے اور کفر و شرک کرنے سے بچائے۔ آمین یارب العالمین!

پیغامِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

رشد علی نواب شاہی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

میں قیامت کے دن تین لوگوں کا مقابل بن کر اُن سے جھگڑوں گا۔ (انھیں میں سے ایک) وہ شخص ہے جس نے کسی کو مزدوری پر رکھا اور اُس سے پورا پورا کام لیا، مگر اُسے (اس کی) پوری مزدوری نہیں دی۔“

(ابن ماجہ عن ابی ھریرۃ ۲۴۴۲)

عزیز ساتھیو! اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں لوگوں کی ضرورتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑا ہے۔ کسی کو گھر تعمیر کرنا ہے تو اُسے مزدوروں کی ضرورت ہوگی، مستری کی ضرورت ہوگی۔ بجلی کے تار لگانے کے لیے الیکٹریشن کی ضرورت ہوگی۔ اسی طرح گھر کا رنگ وروغن کرانا ہے تو رنگ ساز کی ضرورت ہوگی۔ ظاہر ہے، ایک آدمی تنہا یہ سارے کام نہیں کرسکتا۔ جب یہ سب لوگ کام کریں گے تو گھر تعمیر ہوگا۔

ان لوگوں سے، اسی طرح دوسرے کام کاج کرنے والے لوگوں سے ہم کوئی کام کرواتے ہیں اور اُن سے یہ طے کرتے ہیں کہ اس کام کے اتنے پیسے دیں گے تو ہمیں ان کی مزدوری کی اجرت پوری پوری دینی چاہیے۔

بعض اوقات دیکھنے میں آیا ہے کہ مزدور سے کام تو پورا پورا لے لیا، لیکن جب مزدوری دینے کا وقت آیا تو کہہ دیا: کل لے جانا یا آدھے پیسے ابھی دے دیے اور باقی پیسے تھوڑے تھوڑے کرکے دیے، حالاں کہ طے یہ تھا کہ کام پورا ہونے پر یہ اجرت پوری دینی ہوگی، مگر بعض لوگ اپنی بُری عادت کی وجہ سے مزدوری دیتے ہوئے تنگ کرتے ہیں یا دیتے ہی نہیں۔

آپ نے حدیث شریف پڑھی۔ یہ بہت سخت بات ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس مزدور کی حمایت میں ایسے لوگوں کے مقابل تشریف لائیں گے جو کام تو پورا کرواتے ہیں، مگر اُس کام کی پوری اجرت نہیں دیتے اور جس کے مقابل آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئیں اس کی بربادی میں کیا شک ہے۔ ایسا شخص تو سراسر نقصان میں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں مزدور کی اجرت پوری پوری ادا کرنے والا بنائے۔ آمین!

علم کا ذوق، عمل کا شوق بڑھانے والا بچوں کا رسالہ

ماہنامہ

ذوق و شوق

کراچی

زیرِ سرپرستی:

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم

محرم الحرام، صفر المظفر ۱۴۴۳ ہجری | جلد: 16

شمارہ: 09

ناشر: محمد عارف رشید

مجلسِ ادارت

- مدیر: عبدالعزیز
- معاون: محمد طلحہ شاہین

مجلسِ مشاورت

پروفیسر محمد احمد خان صاحب

راشد علی نواب شاہی

سرورق السٹریٹر: سید ناصر

آرٹسٹ: قیصر شریف

کمپوزر: سعد علی

نگران ترسیل: منور عمر

اس رسالے کی تمام آمدنی تعلیم و تبلیغ اور اصلاح امت کے لیے وقف ہے۔

قیمت: 70

سالانہ خریداری بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک: 1000/=

بذریعہ عام ڈاک: 750/=

ماہنامہ ذوق و شوق میں اشتہار شائع کرنے کا مطلب تصدیق ہے نہ سفارش۔ یہ صرف عوام کو مطلع کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ مصنوعات کے بارے میں قارئین خود تحقیق فرمالیں۔

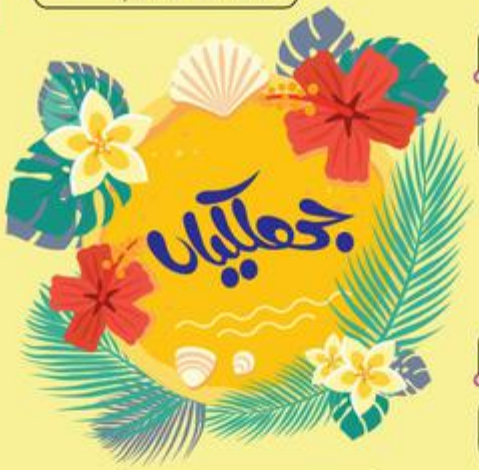

خط و کتابت کا پتہ:

ماہنامہ ذوق و شوق پی۔او۔بکس نمبر 17984 پوسٹ کوڈ 75300 گلشن اقبال، کراچی

Email: zouqshouq@hotmail.com

zouq shouq/ذوق شوق

اشتہارات اور سالانہ خریداری کے لیے رابطہ کریں

0213-4990760, 0341-4410118

What's app: 0324-2028753

دفتری اوقات: صبح 8:00 تا 1:00 دوپہر 2:30 تا 6:00

عنوان	مصنف	صفحہ
سیرت کہانی (۲۸)	عبدالعزیز	04
بلاعنوان (۱۲۹)	قرۃ العین ہاشمی	07
ماں کا لالی	زاہدہ عروج تاج	09
آزادی کا سورج (۲)	ڈاکٹر صفیہ سلطانہ صدیقی	14
برسات (نظم)	صاعقہ علی نوری	18
کراچی کا تاج محل	رابعہ فاطمہ	20
بری بات	شاہد اقبال	22
جھوٹوں کے جھوٹے (۲۰)	حافظ محمد دانش عارفین حیرت	23
درست فیصلہ	محمد اکمل معروف	27
لونگ	سعد علی چھیپا	29
برابری	مریم صدیقی	30
آرزوئے ناتمام (تاریخی جھلکیاں)	محمد حذیفہ رفیق زم زمی	33
پانی تو اچھا ہے	دیا خان بلوچ	36
تتلی (نظم)	محمد ایوب اختر	38
فاتح کون (۲)	نذیر انبالوی	39
مقابلہ خوش خطی (۱۵) (کھیل)	اشتراک: البدر اسکول	41
وقت کی چوری	ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی	42
قرآن کوئز (۱۳) (کھیل)	سعد علی چھیپا	43
نئے لکھاری	قارئین	44
شکر پارے	قارئین	48
میں مروں گا نہیں	الطاف حسین	49

پبلشر محمد عارف رشید نے بچوں کی تعلیمی و تربیتی ترقی و اصلاح کی خاطر ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

PARADISE BOOKS DISTRIBUTORS

Karachi: J-73, UNIT-1, GROUND FLOOR, OFF ALLAMA IQBAL ROAD, PECHS BLOCK-2, KARACHI. 021-34314981
LAHORE: SIDDIQUE MANAZIL, 2ND FLOOR, 40-ABBOT ROAD, STREET NEON PRINCE , LAHORE. 051-48430042
RAWALPINDI: OFFICE NO 2, FIRST FLOOR, STAR PLAZA, PARADISE HOUSE, RAWALPINDI. 042-3629701

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔

ہمارے ایک جاننے والے ہیں، ان کی حیران کن اور خوش کن آپ بیتی معلوم ہوئی۔ آپ انھی کی زبانی سن لیجیے، بل کہ پڑھ لیجیے۔ انھوں نے بتایا:

''ابھی محرم الحرام کی چھٹیاں ہوئیں، موبائل کے سگنل بند ہوئے تو زندگی بے مزہ سی ہوگئی، مزید یہ ہوا کہ کسی خرابی کی وجہ سے انٹرنیٹ سگنل بھی جاتے رہے اور ہم اسے بھی محرم کی سوغات سمجھے۔ اب تو اُکتاہٹ بھی شروع ہوگئی، نہ کہیں جانے کے رہے اور نہ کسی سے بات کرنے کے۔ جانے کے تو اِس لیے نہ رہے کہ راستے بند تھے اور بات کرنے کے اس لیے کہ موبائل بند تھا۔

اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے مرتے کیا نہ کرتے کے مصداق گھر کی اداس لائبریری کی طرف متوجہ ہوئے، ایک کتاب کا انتخاب کیا اور مطالعہ شروع کر دیا۔ شروع شروع میں تو طبیعت نہ لگی، لیکن جلد ہی مزہ آنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے نماز، کھانے پینے، سونے اور ضروری سودا سلف لانے میں صَرف ہونے والے وقت کے علاوہ بقیہ وقت میں 400 صفحات کی کتاب مکمل ہوگئی۔ اپنے اس کارنامے پر ایک طرف تو ہم حیرت کے اور دوسری طرف مسرت کے سمندر میں غوطے لگا رہے تھے، یعنی ہم بے انتہا حیران اور بے حد فرحان تھے، پھر ہم نے یہ تہیا کیا کہ ہم اس موئے موبائل سے کسی قدر جان چھڑا کر اپنی اداس لائبریری سے، جسے ہم ہی نے بڑے چاؤ سے بنایا تھا، رشتہ نہ صرف جوڑیں گے، بل کہ مضبوط بھی کریں گے۔''

ان صاحب کی اس آپ بیتی سے آپ نے کیا نتیجہ اخذ کیا؟

کیا کہا!؟ انٹرنیٹ کنکشن ٹھیک کروائیں گے!

ہاہاہا، ارے بھئی! ہم نے تو یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ان کی طرح ہم بھی موئے موبائل سے کسی قدر جان چھڑانے اور کتاب سے ٹوٹا رشتہ جوڑنے کی کوشش کریں گے۔

آپ اس حوالے سے کیا ارادہ رکھتے ہیں؟

جاتے جاتے ایک بات اور، وہ یہ کہ ستمبر کے مہینے میں ہمارے وطن عزیز پاکستان کی تاریخ میں دو اہم واقعات ہوئے تھے، جنھیں یاد رکھنے کے لیے اس ماہ میں ہم دو دِن بھی مناتے ہیں، ایک ہے یوم دفاع پاکستان اور دوسرا ہے یوم تحفظ ختم نبوت۔ ان کے بارے میں اپنے والد، والدہ، بھائی جان، باجی یا پھر اَساتذہ کرام سے معلومات حاصل کیجیے اور اگر ہو سکے تو اِن کے بارے میں کوئی کتاب پڑھ لیجیے، اس طرح آپ کا بھی کتاب سے رشتہ جُڑ جائے گا۔ ہے نا مفید مشورہ!؟ وہ بھی بالکل مفت!

سیرت کہانی ۲۸

عبدالعزیز

ہمارے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی مبارک زندگی اور سیرت کے اہم واقعات پر مبنی ایک پیارا سلسلہ۔

جب آپ ﷺ مدینے کی طرف ہجرت کرتے ہوئے قبا کے مقام پر پہنچے تو آپ ﷺ کی آمد کی خبر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو بھی پہنچی، جو اُس وقت مدینہ منورہ میں ایک یہودی کے غلام تھے۔ عیسائی تھے، مسلمان نہیں ہوئے تھے، لیکن انھوں نے حضور ﷺ کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا، بل کہ وہ آپ ﷺ کی مدینہ آمد کے منتظر تھے۔ ایسا کیوں تھا؟ وہ خود بیان کرتے ہیں:

''میں ملک فارس میں قصبہ جیٗ کا رہنے والا تھا۔ میرے والد اپنے شہر کے چودھری تھے اور مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے۔ وہ میری بہت زیادہ حفاظت کرتے تھے۔ مجھے باہر نہیں جانے دیتے تھے۔ میرے والد نے مجھے آتش کدے کا محافظ بنا رکھا تھا کہ اس میں جلنے والی آگ، جس کی عبادت کی جاتی تھی، کسی وقت بجھنے نہ پائے۔

ایک روز میرے والد تعمیر کے کام میں مشغول تھے تو مجھے مجبوراً زمین اور کھیت کی خبر گیری کے لیے بھیجا اور یہ تاکید کی کہ دیر نہ کرنا۔ میں گھر سے نکلا، راستے میں عیسائیوں کا گرجا پڑتا تھا، اندر سے کچھ آوازیں سنائی دیں، میں دیکھنے کے لیے اندر جا گھسا۔ دیکھا کہ عیسائی لوگ وہاں عبادت میں مشغول ہیں۔ مجھے ان کی عبادت پسند آئی اور اپنے دل میں کہا کہ یہ دین ہمارے دین سے بہتر ہے۔

میں نے ان لوگوں سے پوچھا کہ

'عیسائی مذہب کی اصل کہاں ہے؟'

ان لوگوں نے بتایا:

'ملک شام میں۔'

ان سے بات چیت میں رات ہوگئی۔ میرے والد اِنتظار کر کے میری تلاش میں نکلے۔ جب میں گھر پہنچا تو والد صاحب نے پوچھا:

'تم کہاں تھے؟'

میں نے تمام واقعہ بیان کر دیا۔ والد صاحب نے کہا:

'اس دین، یعنی عیسائیت میں کوئی خیر نہیں۔ تیرے باپ دادا کا دین، یعنی آتش پرستی بہتر ہے۔' میں نے کہا:

'بالکل بھی نہیں، خدا کی قسم! عیسائیوں کا دین ہمارے دین سے بہتر ہے۔'

یہ سُن کر میرے والد نے میرے پیر میں بیڑیاں ڈال دیں اور گھر سے باہر نکلنا بالکل بند کر دیا۔ میں نے کسی طرح چھپ کر عیسائیوں کو یہ پیغام پہنچایا کہ جب کوئی قافلہ ملک شام جائے تو مجھے اطلاع کر دینا۔ انھوں نے مجھے ایک موقع پر اِطلاع دی کہ عیسائی تاجروں کا ایک قافلہ ملک شام واپس جانے والا ہے۔ میں نے موقع پا کر بیڑیاں پیر سے نکال پھینکیں اور گھر سے نکل کر اُن کے ساتھ ہولیا۔

ملک شام پہنچ کر میں نے پوچھا:

'عیسائیوں کا سب سے بڑا عالم کون ہے؟'

لوگوں نے ایک پادری کا نام بتلایا۔ میں اس کے پاس پہنچا، اس سے اپنا تمام واقعہ بیان کیا اور کہا: 'میں آپ کی خدمت میں رہ کر آپ کا دین سیکھنا چاہتا ہوں، مجھے آپ کا دین پسند ہے۔ آپ اجازت دیں تو آپ کی خدمت میں رہوں، آپ کا دین سیکھوں اور آپ کے ساتھ عبادت کروں؟' اس نے کہا:

'بہتر ہے۔'

لیکن چند روز بعد مجھے تجربہ ہوا کہ وہ پادری اچھا آدمی نہ تھا، بہت ہی لالچی تھا۔ دوسروں کو صدقات اور خیرات کا حکم دیتا اور جب لوگ رقم لے کر آتے تو جمع کر کے خود رکھ لیتا، فقیروں اور مسکینوں کو نہ دیتا۔ اسی طرح اس نے اشرفیوں کے سات مٹکے جمع کر لیے۔

جب وہ مر گیا اور لوگ عقیدت کے ساتھ اس کی تجہیز و تکفین کے لیے جمع ہوئے تو میں نے لوگوں کو اُس کا حال بتایا اور وہ سات مٹکے دکھائے۔

لوگوں نے یہ دیکھ کر کہا:

'خدا کی قسم! ہم ایسے شخص کو ہرگز دفن نہ کریں گے۔'

آخر اُس پادری کو سولی پر لٹکا کر سنگسار کر دیا گیا اور اُس کی جگہ کسی اور عالم کو مقرر کر دیا گیا۔''

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

'میں نے اس عالم سے زیادہ کسی اور کو عبادت کرنے والا، دنیا سے بے تعلق رہنے والا، آخرت کا شوق رکھنے والا نہیں دیکھا اور جس قدر مجھے اس عالم سے محبت ہوئی اس سے پہلے کبھی کسی سے نہیں ہوئی تھی۔

میں مسلسل اس عالم کی خدمت میں رہا، جب اس کی موت کا وقت آ گیا تو میں نے عرض کیا:

'آپ مجھے وصیت کیجیے اور بتائیے کہ آپ کے بعد میں کس کی خدمت میں جا کر رہوں؟' اس نے کہا:

'ایک جگہ ہے موصل، اس میں ایک عالم ہے، تم اس کے پاس چلے جانا۔'

چناں چہ میں ان عالم کے پاس چلا گیا اور اُن موصل والے عالم کے بعد اُن کی وصیت کے مطابق نصیبین میں ایک عالم کے پاس جا کر رہا۔ ان کی وفات کے بعد اُن کی وصیت کے مطابق عموریہ شہر میں ایک عالم کے پاس رہا۔ جب ان بھی کا انتقال ہونے لگا تو میں نے کہا:

'میں فلاں فلاں عالم کے پاس رہا ہوں، اب آپ بتائیں کہ میں کہاں جاؤں؟' اس عالم نے کہا:

'میری نظر میں اس وقت کوئی ایسا عالم نہیں جو کہ صحیح راستے پر ہو اور میں تمھیں اُس کا پتا بتاؤں، البتہ ایک نبی کے ظاہر ہونے کا زمانہ قریب آ گیا ہے جو دین ابراہیمی پر ہوگا۔ عرب کی سرزمین میں اس کا ظہور ہوگا اور وہ ایک نخلستانی زمین کی طرف ہجرت کرے گا۔ اگر تمھارے لیے وہاں پہنچنا ممکن ہو تو ضرور پہنچنا۔ ان کی علامت یہ ہوگی کہ وہ صدقے کا مال نہیں کھائیں گے، ہدیہ قبول کریں گے۔ دونوں شانوں کے قریب نبوت کی مہر ہوگی۔ جب تم دیکھو گے تو پہچان لو گے۔'

اسی اثنا میں میرے پاس کچھ گائیں اور بکریاں بھی جمع ہو گئی تھیں۔ اللہ کی شان! ایک قافلہ عرب جانے والا مجھے مل گیا۔ میں نے ان سے کہا:

'تم لوگ مجھے بھی ساتھ لے چلو، یہ گائیں اور بکریاں سب تمھیں دے دوں گا۔'

ان لوگوں نے اسے قبول کیا اور مجھے ساتھ لے لیا۔ جب وادی قریٰ پہنچے تو میرے ساتھ انھوں نے یہ دھوکا کیا کہ مجھے غلام بنا کر ایک یہودی کے ہاتھ بیچ دیا۔ جب میں نے وہاں کھجور کے درخت دیکھے تو خیال ہوا کہ شاید یہی وہ سرزمین ہو جہاں نبی کا ظہور ہونے والا ہے، لیکن ابھی میں پوری طرح مطمئن نہیں ہوا تھا کہ بنی قریظہ میں میرے مالک کے پاس ایک یہودی آیا اور مجھے میرے مالک سے خرید کر مدینہ لے آیا۔ جب میں مدینہ پہنچا تو خدا کی قسم! میں نے مدینے کو دیکھتے ہی پہچان لیا اور یقین کر لیا کہ یہ وہی شہر ہے جو مجھے بتلایا گیا تھا۔''

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ مزید فرماتے ہیں:

''میں مدینے میں اس یہودی کے پاس رہا اور بنی قریظہ میں اس کے درختوں کا کام کرتا رہا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکے میں نبی بنا کر بھیج دیا، مگر مجھے غلامی اور خدمت کی وجہ سے بالکل پتا نہ چلا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینے تشریف لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبا میں بنی عمرو بن عوف کے یہاں قیام فرمایا تو میں اس وقت ایک کھجور کے درخت پر چڑھا کام کر رہا تھا اور میرا مالک درخت کے نیچے بیٹھا تھا کہ ایک یہودی آیا، جو میرے آقا کا چچازاد بھائی تھا اور کہنے لگا:

'خدا بنی قیلہ، یعنی انصار کو ہلاک کرے! قبا میں کسی شخص کے گرد جمع ہیں جو مکے سے آیا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ شخص نبی ہے۔''

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''خدا کی قسم! یہ سننا تھا کہ مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی اور مجھے لگا کہ میں اپنے آقا پر گر پڑوں گا، بہر حال میں درخت سے اترا اور اُس آنے والے یہودی سے پوچھنے لگا:

'بتاؤ تو سہی، تم کیا بیان کر رہے تھے، وہ ذرا مجھے بھی تو بتاؤ'

یہ دیکھ کر میرے آقا کو غصہ آ گیا اور زور سے مجھے طمانچہ مارا اور کہا:

'تجھے اس سے کیا مطلب؟ تُو اپنا کام کر'

جب شام ہوئی، کام سے فراغت ہوئی تو جو کچھ میرے پاس جمع تھا وہ ساتھ لیا اور آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ اس وقت قبا میں تشریف فرما تھے۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ اور آپ کے ساتھیوں کے پاس کچھ نہیں ہے، آپ سب حضرات ضرورت مند ہیں، اس لیے میں آپ کے لیے اور آپ کے ساتھیوں کے لیے صدقہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا:

'میں صدقہ نہیں کھاتا' اور صحابہ کو اجازت دی کہ تم لے لو۔''

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

''میں نے اپنے دل میں کہا: خدا کی قسم! یہ ان تین نشانیوں میں سے ایک ہے۔ میں واپس آ گیا اور پھر کچھ جمع کرنا شروع کر دیا۔ جب آپ ﷺ مدینے تشریف لائے تو پھر حاضر خدمت ہوا اور عرض کیا:

'میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کی خدمت میں کچھ پیش کروں۔ صدقہ تو آپ قبول نہیں فرماتے، یہ ہدیہ لے کر حاضر ہوا ہوں'

آپ ﷺ نے اسے قبول فرمایا اور خود بھی اس میں سے کھایا، اپنے صحابہ کو بھی کھلایا۔ میں نے اپنے دل میں کہا: یہ دوسری نشانی ہے۔

دو چار روز کے بعد میں پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ ﷺ ایک جنازے کے ساتھ بقیع میں تشریف لائے ہوئے تھے اور صحابہ کرام کی جماعت آپ کے ساتھ تھی۔ آپ ﷺ بیچ میں تشریف فرما تھے۔ میں نے سلام کیا اور سامنے سے اٹھ کر پیچھے آ بیٹھا، تاکہ نبوت کی مہر دیکھوں۔ آپ ﷺ سمجھ گئے اور پیٹھ مبارک سے چادر اُٹھا دی۔ میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا اور اُٹھ کر نبوت کی مہر کو چوما اور رو پڑا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

'سامنے آؤ'

میں سامنے آیا اور اپنا پورا واقعہ آپ ﷺ اور صحابہ کرام کی مجلس میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا اور اُسی وقت اسلام لے آیا۔ آپ بہت خوش ہوئے۔ اس کے بعد اپنے آقا کی خدمت میں مشغول ہو گیا۔ اسی وجہ سے میں غزوۂ بدر اور غزوۂ احد میں شریک نہ ہو سکا۔' ایک مرتبہ آپ ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا:

'سلمان! اپنے آقا سے کتابت کر لو' (کتابت کہتے ہیں، اپنے آقا کو رقم دے کر غلامی سے آزاد ہو جانا)۔

میں نے اپنے آقا سے کہا۔ اس نے جواب دیا:

'اگر تم چالیس اوقیہ سونا ادا کر دو اور تین سو درخت لگا دو، پھر جب وہ پھل دینے لگیں تو تم آزاد ہو'

حضرت سلمان نے آپ علیہ السلام کی اجازت سے اس پیش کش کو قبول کر لیا۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو ترغیب دی کہ سلمان کی کھجور کے پودوں سے مدد کریں۔ کسی نے تیس پودے، کسی نے بیس، کسی نے پندرہ اور کسی نے دس پودے دیے۔ جب پودے جمع ہو گئے تو آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا:

'اے سلمان! ان کے لیے گڑھے کھودو'

جب گڑھے تیار ہو گئے تو خود اپنے ہاتھ سے ان پودوں کو لگایا اور برکت کی دعا دی۔ ایک سال گزرنے نہ پایا تھا کہ سب کے سب سرسبز و شاداب ہو گئے اور سب میں پھل لگ گیا۔ درختوں کا قرض تو یوں ادا ہو گیا، صرف دراہم باقی رہ گئے۔''

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

ایک روز ایک شخص آپ علیہ السلام کے پاس ایک انڈے کے برابر سونا لے کر آیا، آپ ﷺ نے فرمایا:

'وہ مسکین مکاتب، یعنی سلمان فارسی کہاں ہے؟ اسے بلاؤ'

میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے وہ انڈے کے برابر سونا مجھے دے دیا اور یہ ارشاد فرمایا:

'اسے لے جاؤ، اللہ تمھارا قرضہ ادا فرمائے گا' میں نے عرض کیا:

'یارسول اللہ! سونا بہت تھوڑا ہے، اس سے میرا قرض کہاں ادا ہو گا؟'

آپ ﷺ نے فرمایا:

'جاؤ، اللہ اسی سے تمھارا قرضہ ادا کروا دے گا'

جب میں نے اسے تولا تو پورا چالیس اوقیہ تھا۔ میرا کل قرضہ ادا ہو گیا۔ میں غلامی سے آزاد ہوا، آپ علیہ السلام کے ساتھ غزوۂ خندق میں شریک ہوا اور اُس کے بعد تمام غزوات میں آپ ﷺ کے ساتھ ساتھ رہا۔

(سیرت ابن ہشام، ج:1، ص:73)

بعض علمائے کرام فرماتے ہیں کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ساڑھے تین سو برس زندہ رہے۔ ڈھائی سو سال عمر میں تو کسی کو شک ہی نہیں۔ (طبقات الاصبہانیین)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ خود فرماتے ہیں:

میں دس مرتبہ سے زیادہ بیچا گیا۔ (صحیح بخاری)

.....(جاری ہے).....

''نالائق بچو! یہاں کیوں کھیل رہے ہو؟''

نجم علی نے اپنے گھر کا بیرونی دروازہ کھولتے ہوئے سخت لہجے میں گلی میں کھیلتے بچوں سے کہا۔

بچے جو ہنسی خوشی کھیل رہے تھے نجم علی کی سخت آواز سُن کر ڈر گئے۔

''انکل! میدان میں بارش کا پانی بھرا ہوا ہے، اس لیے ہم گلی میں کھیل رہے ہیں۔''

فراز نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کی عمر تیرہ سال تھی۔

''اگر ایک دن نہیں کھیلو گے تو مصیبت نہیں آجائے گی۔ چلو بھاگو یہاں سے۔'' نجم علی نے غصے سے کہا۔

''مگر!'' ایک اور بچے اسامہ نے کچھ کہنا چاہا۔

''بحث کرتے ہو بدتمیز لڑکے!؟''

نجم علی نے آگے بڑھ کر اُسامہ کا کان پکڑ لیا۔

''انکل! معاف کردیں۔ بہت درد ہو رہا ہے۔''

اسامہ نے تکلیف سے تڑپتے ہوئے کہا۔

''چلو، پہلے معافی مانگو اور مرغا بنو۔''

نجم علی نے غصے سے کہا۔

''مگر انکل!'' اسامہ نے آس پاس کھڑے سب دوستوں کی طرف دیکھا۔

''سنتا ہے کہ نہیں۔'' نجم علی نے اور زور سے کان کا مروڑا۔

''انکل پلیز!'' اسامہ تکلیف سے تڑپ اٹھا۔

''انکل! پلیز! میرے بھائی کو چھوڑ دیں۔''

ایک پندرہ سال کا لڑکا کہتے ہوئے آگے بڑھا۔ اس کا نام راشد تھا۔

''اپنے استاد کے ساتھ زبان چلاتے ہو۔'' نجم علی، اسامہ کو چھوڑ کر راشد کو ڈانٹنے لگے۔ راشد جس اسکول میں پڑھتا تھا نجم علی وہاں پڑھاتے تھے۔

نجم علی کو غصے میں دیکھ کر محلے کے چند بزرگ آگے بڑھے۔ بمشکل سمجھا بجھا کر اُن کا غصہ ٹھنڈا کیا۔

''یہ لڑکے میرے ساتھ بدتمیزی کرتے ہیں، جب کہ میں ان کا اسکول ٹیچر بھی ہوں۔'' نجم علی نے ناگواری سے کہا۔

''بچوں کی طرف سے ہم معذرت کرتے ہیں۔ آئندہ یہ ایسا نہیں کریں گے۔'' ایک بزرگ نے نرم لہجے میں کہا۔

نجم علی کی عمر تیس سال کے قریب تھی اور کچھ عرصہ پہلے وہ تدریس کے شعبے سے منسلک ہوئے تھے۔ نجم علی کو اِس محلے میں آئے ابھی کچھ مہینے ہی ہوئے تھے۔ ویسے تو نجم علی ایک اچھے استاد تھے، مگر اُن کے غصے اور سخت لہجے کی وجہ سے سب بچے ان سے دور رہتے تھے۔ نجم علی کا ایسا سخت رویہ اسکول میں بھی سب بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی بات پر بچوں کو بہت سخت سزا دیتے۔ اکثر بچوں کے والدین شکایت لے کر بھی آتے، مگر نجم علی ہمیشہ اس بات پر زور دیتے کہ ان کے بچے ہی خراب ہیں۔ والدین چپ ہوجاتے اور اپنے بچوں پر مزید سختی کرتے۔

بچے اس صورت حال سے بہت تنگ آچکے تھے۔ نہ والدین ان کی سن رہے تھے اور نہ اسکول میں کوئی ان کی مشکل سمجھ رہا تھا۔

وقت گزرتا رہا، مگر نجم علی نے اپنا سخت رویہ تبدیل نہیں کیا۔ کچھ عرصے بعد، نتیجہ یہ نکلا کہ آہستہ آہستہ بچوں نے ان کے دورانیہ لینا چھوڑ دیا۔ اکثر بچے گھر سے اسکول کا کہہ کر نکلتے، مگر اسکول جانے کے بجائے دوسری گلی میں جا کر گیم کھیلنے لگتے، جہاں بہت سے گیمز کی دکانیں تھیں۔ اب بچوں کی دل چسپی ان چیزوں کی طرف ہوگئی۔ چوں کہ ان کے محلے سے کوئی دیکھنے یا روکنے والا نہیں تھا اس لیے وہ بے فکر ہو کر کھیلنے کے لیے جانے لگے۔ کچھ بچوں کو ویڈیو گیمز کی لت لگ گئی۔

کچھ دن بعد سب بچوں کی اسکول سے شکایتیں آنے لگیں۔ محلے میں چوریاں بڑھ گئیں۔ تب محلے کے بزرگ چونکے۔ انھوں نے محلے کے کچھ سمجھ دار اور شریف لڑکوں کو جاسوسی پر مامور کیا اور پھر اُن پر اِنکشاف ہوا کہ اس محلے کے بچے تباہی کی طرف جا رہے ہیں۔ سب بچے سالانہ امتحان میں بُری طرح فیل ہوئے۔ ان میں سے چند لڑکے چوری کرتے ہوئے بھی پکڑے گئے۔ جنھیں ویڈیو گیمز کی لت لگی تھی ان کی جسمانی اور ذہنی حالت بہت خراب

بہترین عنوان تجویز کرنے پر 250، دوسرا بہترین عنوان تجویز کرنے پر 150، تیسرا بہترین عنوان تجویز کرنے پر 100 روپے انعام دیا جائے گا۔ ''بلاعنوان'' کے کوپن پر عنوان تحریر کر کے ارسال کریں۔

عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 30 ستمبر 2021 ہے۔

نوٹ: کمیٹی کا فیصلہ حتمی ہوگا جس پر اعتراض قابل قبول نہ ہوگا۔

ہو چکی تھی۔

محلے کے بزرگ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ اسکول کا نتیجہ خراب آیا تو پرنسپل صاحب بھی فکر مند ہو گئے۔ اسکول کا نام بدنام ہو رہا تھا۔ اسکول کی ساکھ کو بچانے کے لیے پرنسپل صاحب نے بہت سے سخت اقدام کیے۔ وہ ہر حال میں اسکول کا معیار پہلے کی طرح برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

ایک دن محلے کے چند بزرگ مل کر پرنسپل صاحب کے آفس پہنچ گئے اور اُن کے سامنے سارا معاملہ پیش کیا۔ پرنسپل صاحب نے نجم علی کو اپنے آفس میں بلا لیا۔

نجم علی بھی اس ساری صورت حال سے بہت پریشان اور افسردہ تھے۔

''بلاشبہ آپ ایک اچھے استاد ہیں، مگر آپ کی بلاوجہ کی سختی اور بات بات پر سزا دینے والی عادت کی وجہ سے بچے ڈر کر غلط سمت کی طرف نکل گئے ہیں۔'' ایک بزرگ نے سخت لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا ؟ میں یہ سب بچوں کی بہتری کے لیے کرتا ہوں۔'' نجم علی نے حیرت سے کہا۔

''بیٹا! آپ کی سختی، غصے اور منفی سوچ کی وجہ سے ہمارے بچے غلط راستے کی طرف چل نکلے ہیں۔ اس وجہ سے وہ تعلیم سے بھاگنے لگے ہیں۔'' بزرگ نے سنجیدگی سے کہا۔

''وہ سب سختی اس لیے ہے تاکہ بچے خوف زدہ ہو کر سیدھی راہ پر چلیں اور اپنی تعلیم پر توجہ دیں۔'' نجم علی نے سنجیدگی سے کہا۔

''مگر بیٹا! کیا آپ نہیں جانتے کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ نے اسلام کی تبلیغ کیسے کی۔ آپ ﷺ کے اچھے اعمال، بہترین کردار، میٹھے بولوں کی وجہ سے دشمن بھی آپ ﷺ کے بہترین اخلاق کی گواہی دیتے تھے۔ ہمارے نبی ﷺ سے بہتر اُستاد تو کوئی بھی نہیں۔'' پاس بیٹھے دوسرے بزرگ نے کہا۔

ایک حدیث شریف ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''آسانی کرو، تنگی نہ کرو، (اللہ کے فضل و عطا کی) خوش خبری دو، (صرف عذاب کا ذکر کر کے) لوگوں کو متنفر نہ کرو۔'' (صحیح بخاری۔69)

پہلے والے بزرگ نے حدیث سنائی تو نجم علی نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

''بچے سخت سزاؤں اور مار کے ڈر کی وجہ سے اسکول آنا چھوڑ چکے ہیں، بل کہ وہ دوسری سرگرمیوں میں لگ گئے ہیں، کیوں کہ وہ آپ سے تعلیم حاصل کرنا نہیں چاہتے۔ ہم نے سب بچوں سے بات کی ہے۔ وہ صرف آپ کی وجہ سے اسکول کے نام سے چڑنے لگے ہیں۔''

بزرگ نے سنجیدگی سے کہا۔ کچھ دیر وہ سب خاموش رہے، پھر وہ بزرگ بولے:

''باقی آپ سمجھ دار ہیں۔''

''سر نجم علی! میرے خیال سے آپ کو اپنے پڑھانے کے طریقے کو تھوڑا تبدیل کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ بچے ڈر کر غلط راستہ اختیار نہ کریں۔'' پرنسپل صاحب نے سنجیدگی سے کہا۔ نجم علی بہت غور سے ان کی بات سن رہے تھے۔

''آج کل تو بچوں کی نفسیات کو سامنے رکھ کر ایسے طریقے اختیار کیے

بقیہ صفحہ نمبر 32 پر

ماں کا لالی

زاہدہ عروج تاج۔ بہاول پور

''لالی ی ی!''

بچے کے پہاڑ سے پھسلنے کے ساتھ ہی ماں کی آواز پہاڑوں میں گونجی اور پھر وہ فوراً بچے کے پیچھے لپکی۔ چند لمحوں میں وہ بچے کو گود میں اٹھائے اسے پیار کر رہی تھی۔

''نظر لگ گئی میرے لالی کو!'' بچے کو پیار کرتے ہوئے ماں کی زبان پر ایک ہی جملہ تھا۔ شکر تھا کہ معمولی رگڑیں ہی لگی تھیں۔

''اب کل میری اسکول سے چھٹی ہوگی نا! دیکھیں میرے بازو سے خون نکل رہا ہے۔'' ننھے لالی نے ماں کو بازو دِکھایا۔

''چلو چھٹی، لیکن بہادر بچے اتنے معمولی زخموں کی پروا بھی نہیں کرتے اور میرا لالی تو مارخور سے بھی زیادہ بہادر اور پھرتیلا ہے۔''

''ہاں اماں! میں تو مارخور سے بھی بہادر بچہ ہوں، اب میں چھٹی نہیں کروں اور اِسکول ضرور جاؤں گا۔''

''بالکل! میرا چیتا! میری جان!'' ماں نے شفقت سے کہتے ہوئے بچے کو چمٹا لیا۔

لالی ابھی دوسری جماعت میں تھا کہ اس کی اماں اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ لالی کی زندگی کا تو محور ہی ٹوٹ گیا۔ ''میرا لالی'' اور ''میرا چیتا'' کہہ کر جان نچھاور کرنے والی ماں نہ رہی۔ گھر کا ہر فرد غم سے نڈھال تھا۔

ماں کے مرنے کے بعد لالی نے اسکول چھوڑ دیا۔ نشانہ بازی اس کا خاص شوق تھا۔ وہ سارا دِن غلیل ہاتھ میں لیے نشانہ پختہ کرنے اور چڑیوں کا شکار کرنے میں گزار دیتا۔ کبھی کبھار والد کے ساتھ بکریاں چرانے بھی چلا جاتا۔

وہ پہاڑوں پر مارخور کی سی تیزی سے چڑھ جاتا تھا۔ اگر کوئی بکری یا جانور پہاڑ کی گھاٹی وغیرہ میں پھنس جاتا تو اُسے نکالنے کا کام خاص طور پر لالی ہی انجام دیتا۔

وقت کا کام گزرنا ہے، گزر جاتا ہے۔

ایک دن لالی کے تایا اور تائی جان نے اسے سمجھایا، لیکن ماں کے بعد لالی کی طبیعت میں کافی ضدی پن آ گیا تھا، وہ نہ مانا۔

ایک مرتبہ لالی کے بڑے بھائی گل سمیر جان گھر آئے تو لالی اپنا نشانہ پختہ کرنے کی مشق کر رہا تھا۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا:

''تم ہر وقت نشانہ بازی کی مشق کرتے رہتے ہو، آج مجھ سے مقابلہ کرو۔''

''آپ اکثر مجھ سے نشانہ بازی کا مقابلہ کرتے ہیں اور ہار جاتے ہیں۔''
لالی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن پاک فوج میں جا کر میرا نشانہ بہت اچھا ہو گیا ہے، اب تم مجھ سے نہیں جیت سکتے۔'' بڑے بھائی نے مسکراتے ہوئے چیلنج کیا۔

''چلیں، مجھے آپ کا چیلنج قبول ہے۔''

''یہ بات ہے تو چلو پھر ہو جائے مقابلہ!''

دونوں بھائی یاسین گاؤں کی حسین وادی میں نکل آئے۔ ایک چشمے کے قریب اپنے ہدف لگائے اور بڑے بھائی نے اپنی غلیل سے پانچ نشانے لگائے۔ بڑے بھائی کا صرف ایک نشانہ خطا ہوا۔

اب باری لالی کی تھی۔ لالی کے پھینکے گئے پانچ کے پانچ پتھر اپنے مطلوبہ ہدف تک پہنچے، اس طرح چھوٹا بھائی جیت گیا۔ بڑے بھائی نے چھوٹے کو گلے لگایا اور کہا:

''میرے شیر! اپنی اس صلاحیت کو ضائع نہ کرو، ملک و قوم کے دفاع کے لیے استعمال میں لاؤ، دشمن کے دانت کھٹے کرو۔''

بڑے بھائی کی حوصلہ افزائی سے لالی نے این۔ ایل۔ آئی۔ ٹریننگ سینٹر میں داخلہ لے لیا۔ پہاڑی اور مضبوط تن توش کا مالک ہونے اور نشانہ بازی کی مہارت کی وجہ سے داخلے کا مرحلہ بخوبی پاس کیا۔

۱۹۸۴ء میں پاک فوج میں بھرتی ہوا۔ نو ماہ کی تربیت کے بعد اُس کی پوسٹنگ ۱۲۔ این۔ ایل۔ آئی۔ رجمنٹ میں ہو گئی۔ مئی ۱۹۸۸ء میں دوران ملازمت میں ہی اس نے میٹرک کا امتحان آرمڈ فورسز بورڈ سے پاس کیا۔

۱۹۸۴ء میں پاکستانی فوج کو موسم سرما اور شدید برف باری کی وجہ سے کارگل کی کچھ پوسٹس خالی کرنی پڑیں تھیں اور ہمیشہ کی طرح بھارتی فوج نے این۔ او۔ سی۔ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ان پوسٹوں پر ناجائز قبضہ کر لیا تھا۔ ان پوسٹوں کو خالی کروانے کے لیے کئی سال کوششیں کی جاتی رہیں، لیکن بھارت کی طرف سے ان پوسٹوں پر پوری ایک ڈویژن آرمی تعینات کر دی گئی تھی۔ بالآخر ۱۹۹۹ء میں پاکستانی فوج نے گوریلا حملے کر کے بھارتی فوجیوں کو ٹھکانے لگانے کا سلسلہ شروع کیا۔

بھارتی فوجیوں کے لاپتا ہونے کا سلسلہ عروج پر پہنچا تو اُس کے نتیجے میں جولائی ۱۹۹۹ء میں کارگل محاذ پوری طرح کھل گیا اور دونوں افواج کھل کر ایک دوسرے کے سامنے آ گئیں۔

۱۹۹۲ء میں لالی کو پیر گھنٹی کے مشکل محاذ پر تعینات کر دیا گیا تھا۔ ایک سال بعد ۱۹۹۳ء میں انھیں حوال دار کے عہدے پر ترقی مل گئی۔ لالی کی تعلیم زیادہ نہ تھی، مگر بنیادی طور پر وہ ایک ذہین انسان تھے۔ اپنے کام سے کام رکھنے والے تھے، مگر حساس بھی تھے۔ خاندان میں کوئی جھگڑا ہو جاتا تو صلح صفائی کے لیے ان کا چھٹی پر آنے کا انتظار کیا جاتا۔ دوران ملازمت ہی میں انھوں نے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مل کر ''المدد ویلفیئر فاؤنڈیشن'' بنائی اور اپنی تنخواہ سے ممکن حد تک بچت کر کے فاؤنڈیشن کا چندہ دیتے۔

آخری مرتبہ مئی ۱۹۹۹ء میں گلگت اپنے گھر گئے۔ کارگل محاذ والا معاملہ گھمبیر ہوا تو اُنھوں نے بھی محاذ پر جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس طرح ۱۲۔ این۔ ایل۔ آئی۔ رجمنٹ کے صوبے دار سکندر اور دس مزید ساتھیوں کے ساتھ وہ محاذ پر پہنچے۔ صوبے دار سکندر چوٹی کے انچارج اور سیکنڈ اِن کمان تھے۔ جس چوٹی پر اُنھیں تعینات کیا گیا اس کا نام ٹائیگر ہل تھا۔

بھارت چوٹیوں کے ہاتھ سے نکل جانے پر تلملایا ہوا تھا اور پریشان تھا کہ دوبارہ کیسے چوٹیوں پر قبضہ جمایا جائے۔ پاکستان کے بیٹے سروں پر کفن باندھے جواں مردی کے ساتھ دشمن سے برسرِ پیکار تھے۔

.....☆.....

''ایک تو تمھارا نام کافی مشکل ہے جوان! کیا نام بتایا تھا تم نے اور مطلب کیا ہے تمھارے نام کا؟''

صوبے دار سکندر نے دور تک پھیلی برف سے نظریں ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

''سر جی! اکثر لوگوں کو میرا نام مشکل لگتا ہے یا وہ بھول جاتے ہیں تو میں انھیں ایک ہی بات کہتا ہوں.....'' حوال دار نے مودب انداز سے کہا۔

''کیا بھلا!؟ صوبے دار نے دل چسپی سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

کارگل کی برف پوش چوٹیاں افسروں اور جوانوں کو ایک ایسے انوکھے بندھن میں باندھ دیتی ہیں جہاں عہدوں کے تقاضوں کی اہمیت کہیں پیچھے رہ جاتی ہے اور برف کے قیدی بن کر سرحدوں کی حفاظت کرنے والے ایک دوسرے کے لیے دوست، ماں باپ اور بہن بھائی، غرض ہر رشتہ بن جاتے ہیں، ایسے ہی تعلق کے تحت صوبے دار نے حوال دار سے پوچھا۔

''وہی کہہ لیا کریں جو میری ماں مجھے پیار سے کہتی تھی۔'' حوال دار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو ماں کیا کہہ کر بلاتی تھی میرے جوان کو، ہمم.....''

صوبے دار نے مسکراتے ہوئے حوال دار کے شانے پر ہاتھ مارا۔
''ماں کہتی تھی: میرا لالی، میرا چہیتا، میرا سورج، میری جان۔'' انھوں نے افسردہ سی مسکراہٹ سے کہا۔
''تو میرے سورج! یہاں کیسے طلوع ہوئے تم؟''
صوبے دار نے یوں ہی بات بڑھانے کے لیے پوچھا۔
رات کا اندھیرا جب برف پر اپنا سکوت پھیلا دیتا تو سب جوان مل بیٹھتے، دکھ سکھ بانٹتے، ہنسی مذاق کرتے اور یوں مل جل کر اُن برف کی وادیوں میں لہو گرماتے۔
''بس کیا بتاؤں سر جی! بابا نے تو اسکول میں داخل کروایا تھا، مگر ہم تھے خطروں کے کھلاڑی، بل کہ شکاری، تیسری کلاس میں ہی اسکول سے بھاگ گئے اور ستاروں سے آگے جہان تلاش کرنے نکل گئے۔''
حوال دار کے انداز پر آگ کے اردگرد بیٹھے سب جوان مسکرا دیے۔
''ارے واہ! اتنی سی عمر سے ستاروں سے آگے جہانوں کی تلاش! ویسے کس راکٹ پر یہ سفر شروع کیا تھا لالی!؟'' ایک ساتھی نے ہنستے ہوئے شرارت کی۔
''راکٹ تو ہمارے پاس تھا نہیں، ہمارے پاس غلیل تھی غلیل، اور کیا نشانہ تھا ہمارا کہ واہ وا......واہ وا......'' حوال دار نے اشارے سے غلیل سے پتھر پھینکا۔
''ہم ہوتے، ہماری غلیل ہوتی، ہم سارا سارا دن نشانہ بازی کرتے، پرندے شکار کرتے، پھر ایک دن ہمارا بڑا بھائی فوج سے چھٹی پر گھر آیا، ہمارا اُس سے نشانہ بازی کا مقابلہ ہوا۔ ہم چھوٹا ہو کر جیت گیا۔ بھائی نے ہمیں بہت شاباش دی اور کہا کہ خود کو ضائع مت کرو یار! پرندوں سے زیادہ مزہ دشمن کو شکار کرنے میں آتا ہے اور تمھارا تو نشانہ بھی خوب ہے، کوئی گولی ضائع نہیں جائے گی۔
بس ہمیں بھی جوش آ گیا، اگلے دن ہی بابا سے اجازت لے کر ماموں کے بیٹے مراد کو ساتھ لیا اور پونچھ کے علاقے میں موجود ناردرن لائٹ انفنٹری ٹریننگ سنٹر پہنچ گیا۔ داخلہ بھی بغیر کسی پریشانی کے ہو گیا اور پھر نو ماہ کی ٹریننگ کے بعد این۔ ایل۔ آئی۔ میں مجھے تعینات کر دیا گیا۔
بھائی کو خبر ہوئی تو خط لکھ کر مجھے شاباش دی۔ یوں ہوتے ہوتے میں یہاں طلوع ہو گیا۔''
حوال دار سانس لینے کے لیے رُکا اور پھر اپنی کہانی کا اختتام کرتے ہوئے کہا:
''فوج میں قدم جمے تو بابا کو ہماری اور بڑے بھائی کی شادی کا شوق ہو گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ بچے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے ہیں، پر آپ یقین کریں سر! ہم دونوں بہت سالوں سے اپنے ہی پاؤں پر چل پھر رہے تھے اور کھڑے تھے۔ اب میری دو بیٹیاں اور ایک بیٹا بھی اپنے پاؤں پر چل رہے ہیں الحمدللہ!''
حوال دار کی اس بات پر برف کے باسیوں کے قہقہے ایک بار پھر تاریک رات میں جگنو بن کر پھیل گئے۔ وہ اپنی کہانی اس انداز میں سنا رہا تھا کہ سب کافی دل چسپی سے سن رہے تھے۔

......☆......

یکم جولائی ۱۹۹۹ء کو بھارت کی ۱۸ گرنیڈ بٹالین نے آرٹلری (توپ خانے) کی مدد سے ٹائیگر ہل پر بہت زوردار حملہ کیا۔ صوبے دار سکندر نے اپنے جوانوں کو اپنی اپنی پوزیشن سے حملہ کرنے کو کہا، جس کی وہ پہلے ہی ہدایات دے چکے تھے۔ اس طرح انھوں نے اپنے دفاع کے ساتھ بھارتی فوج کے حملے کو پسپا کر دیا۔
بھارتی ۱۸ گرنیڈ نے اپنے کئی جوان اس حملے میں کھوئے۔ اگلی صبح ۱۸ گرنیڈ نے پہلے سے بھی سخت حملہ کیا۔
صوبے دار سکندر نے جوانوں کو بنکرز کے اندر جانے کا حکم دیا اور جوانوں سے اگلی حکمت عملی طے کی، جس کے بعد یہ طے ہوا کہ حوال دار لالی، ٹائیگر ہل سے نیچے اتر کر بھارتی آرٹلری فورسز کے سامنے کے علاقے میں بارودی سرنگیں بچھائے۔
یہ بات تقریباً ناممکن تھی، لیکن اگلے دن جب یہ مشن مکمل کرنا تھا نصرت خداوندی دھند کی شکل میں نمودار ہوئی۔ بھارتی فورسز کو اتنی سخت دھند میں کسی ایسی کارروائی کا گمان تک نہ تھا۔ حوال دار لالی نے نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے دھند کے بادلوں میں اپنے قدم بڑھائے، مزید پاک فوج نے انھیں کور فائر بھی دیا۔
لالی ان پہاڑوں، وادیوں اور دُھند کے بادلوں میں کھیلتے بڑے ہوئے تھے، وہ اس قدرتی صلاحیت کی وجہ سے بھی آسانی سے ٹائیگر ہل سے نیچے اترے اور بارودی سرنگیں اس طرح بچھائیں کہ اگر بھارتی آرٹلری، ٹائیگر ہل پر چڑھنے کی کوشش کرتی تو اِن بارودی سرنگوں کی وجہ سے کافی نقصان اٹھاتی۔
حوال دار، اللہ کے حکم سے کامیابی سے یہ مشن مکمل کر کے واپس آئے تو پاک فوج کے جوانوں نے فائر کم کرتے کرتے مکمل بند کر دیا۔ فائرنگ ختم ہونے پر بھارتی فوج جب آگے بڑھنے لگی تو کچھ ہی دیر بعد ایک زوردار دھماکا ہوا، پھر پے در پے دھماکے ہونے لگے اور بارودی سرنگیں بھارتی فورسز کا استقبال کرنے لگیں۔ اس سے نہ صرف بھارتی فوج کی نقل و حرکت رک گئی، بل کہ انھیں بھاری مالی نقصان اور اَن گنت ہلاکتوں کا بھی سامنا کرنا

پڑا اور اُس کے بعد تین سے چار دِن تک وہ ٹائیگر ہل پر حملہ بھی نہ کر سکے، یہاں تک کہ انھیں مزید فوجی کمک نہ پہنچ گئی۔

۶ جولائی کو ۱۸ گرنیڈ اور ۸ سکھوں نے مل کر اَب تک کے حملوں میں سب سے بڑا اور سخت حملہ کیا۔ کچھ بھارتی فوجیوں نے پہاڑ کی ڈھلان کی طرف سے بھی حملہ کیا۔ این۔ ایل۔ آئی۔ کو اِس طرف سے حملے کی بالکل بھی توقع نہیں تھی، اس لیے انھیں اس کی بھاری قیمت چکانی پڑی اور صوبے دار سکندر سمیت سات جوانوں نے اس حملے میں جامِ شہادت نوش کیا اور این۔ ایل۔ آئی۔ کے کئی بنکر تباہ ہو گئے۔

اب ٹائیگر ہل پر حوال دار لالی اور دوسرے تین جوان رہ گئے تھے۔ انڈین فوج کے شدید حملے جاری تھے اور وہ تیزی سے ٹائیگر ہل کی جانب بڑھ رہے تھے۔ حوال دار لالی اپنے جوانوں کے سینئر تھے۔ انھوں نے جوانوں کو ''اِسٹریٹیجک'' حملے (پوزیشن بدل بدل کر) مسلسل فائر کرنے کا حکم دیا، تاکہ دشمن کو اُن کی کم تعداد کا اندازہ نہ ہو سکے۔

جوانوں نے نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ دشمن پر حملہ کیا اور اِس طرح ایک بار پھر اُنھوں نے دشمن کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔

۷ جولائی کو بھارتی ۱۸ گرنیڈ اور ۸ سکھوں کے ساتھ ۶ ناگا بھی کارروائیوں میں شامل ہو گئے، جس کے نتیجے میں دو مزید پاک جوانوں نے جامِ شہادت نوش کیا، محاذ پر صرف حوال دار لالی اور مخمل خان رہ گئے اور وہ دونوں بھی زخمی تھے۔ اب مخمل خان، حوال دار لالی کو اِیمونیشن فراہم کرنے لگے اور حوال دار لالی فائرنگ کرنے لگے، لیکن اسی دوران میں مخمل خان زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اب محاذ پر حوال دار لالی تنہا تھے۔

اس کے باوجود اُنھوں نے چار گھنٹے تک دشمن کی پیش قدمی کو روکے رکھا۔ اس دوران میں نامعلوم وجوہات کی بنا پر اِنڈین فورسز پیش قدمی روک کر ٹائیگر ہل سے اترنا شروع ہو گئیں۔

بھارتی فوج کی اس جارحیت کے بعد کیپٹن عامر کی قیادت میں تیسرے جوانوں کو بھیجا گیا۔ حوال دار کی حالت دیکھتے ہوئے کیپٹن عامر نے انھیں بیس کیمپ میں جانے کا کہا، کیوں کہ ان کا ایک بازو تقریباً ضائع ہو چکا تھا اور وہ لڑنے کی پوزیشن میں نہ تھے۔

لیکن انھوں نے کہا:

''سر! بستر مرگ پر ہسپتال میں مرنے سے زیادہ میں میدان جنگ میں مرنا پسند کروں گا۔''

اسی اثنا میں قریبی پہاڑی سے شدید فائرنگ شروع ہو گئی۔ کیپٹن عامر نے محسوس کیا کہ فائر کسی خفیہ بنکر سے آ رہے ہیں۔ ایسی صورت میں جوابی فائرنگ بے سود اور اَسلحے کا زیاں ہوتی ہے۔ خفیہ بنکر کو تباہ کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ بنکر کی قریب ترین جگہ پر جا کر حملہ کیا جائے۔

کیپٹن عامر نے یہ مشن خود مکمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ حوال دار لالی نے اپنا بارودی سرنگیں بچھانے کے مشن کا بتایا اور یہ کہ وہ اس علاقے کو زیادہ بہتر جانتے ہیں تو یہ مشن انھیں مکمل کرنے کی اجازت دی جائے۔

''لیکن تمھارا بازو زخمی ہے اور مشن بہت اہم اور مشکل ہے میرے جوان!''

کیپٹن عامر مشن کی اہمیت کے پیشِ نظر کوئی رسک لینا نہیں چاہتے تھے۔

''سر! بچپن میں ایک مرتبہ میرا بازو زخمی ہو گیا تھا تو میری ماں نے کہا تھا کہ بہادر بچے اتنی معمولی سے زخم پر چھٹی نہیں کرتے۔ سر! مجھے ثابت کرنے دیں کہ میں صرف اپنی ماں ہی کا نہیں، دھرتی ماں کا بھی بہادر بچہ ہوں۔''

لالی جذبۂ شہادت سے سرشار اور پُرعزم تھے اور آخر کار بصد اِصرار اُنھوں نے اپنی بات منوا کر دم لیا۔

انھوں نے زخمی بازو کی اچھی طرح مرہم پٹی کروائی اور دھماکا خیز مواد کا تھیلا اپنی پشت پر لادا، اے۔ کے۔ ۴۷ اپنے کندھے پر لٹکائی اور خفیہ بنکر کی طرف بڑھنے لگے۔ اس دوران میں بھارتی شیلنگ جاری تھی۔ بنکر کے قریب پہنچ کر اُنھوں نے بنکر کے مقام کا خوب تعین کیا، پھر اللہ کا نام لے کر بارودی مواد والا تھیلا بنکر کے اندر پھینک دیا اور فوراً آڑ لینے میں کام یاب ہو گئے۔ خفیہ بنکر اِیمونیشن سے بھرا ہوا تھا۔ بارودی مواد کے گرتے ہی ایک زوردار دھماکا ہوا اور پھر ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل نکلا۔ یہ کارگل جنگ کا سب سے بڑا دھماکا تھا۔

دھماکا ہوتے ہی تقریباً پچیس تیس بھارتی فوجیوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ دھماکوں کے اثرات کچھ زائل ہوتے ہی حوال دار بھی بھارتی فورسز کی

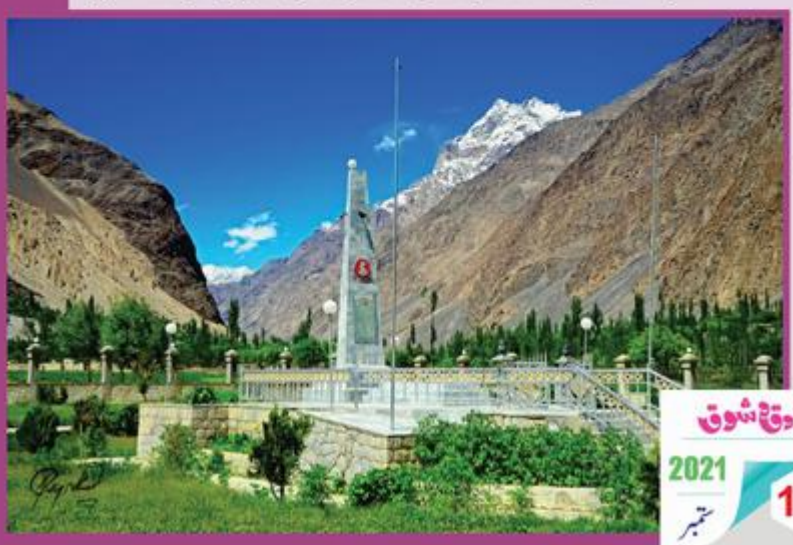

نظروں میں آ گئے اور ساتھ ہی ان پر شدید فائرنگ شروع ہوگئی۔ وہ مسلسل اپنی پوسٹ کا دفاع کررہے تھے اور اس دوران میں شدید زخمی ہو چکے تھے، پھر فائرنگ کے دوران میں ایک مارٹر گولہ لگنے پر وہ زخموں کی تاب نہ لا سکے اور جان، جان آفرین کے سپرد کرتے ہوئے اپنے شہید ساتھوں کے پیچھے عازم سفر ہوئے، لیکن زندگی کے آخری سانس تک بھارتی فورسز کو اپنی موجودہ پوسٹ پر قابض نہ ہونے دیا۔

۱۵ ستمبر کو ۱۲۔ این۔ ایل۔ آئی۔ کے کمانڈنگ آفیسر نے دو کمانڈو فورسز (ابابیل اور عقاب) کو اُن کی تلاش میں بھیجا۔ ابابیل، عقاب کو کور فائر مہیا کر رہی تھی۔ اس طرح عقاب فورسز بھارت کے تباہ شدہ بنکر تک پہنچ گئیں۔ جب کمانڈوز کو حوال دار لالی کا جسد خاکی ملا تو اُنھوں نے اے۔ کے۔ ۴۷ اپنے سینے سے لگائی ہوئی تھی۔ یہ شہید جو اپنی ماں کا لالی اور چہیتا تھا، اب پاک فوج اور پاک قوم کا بھی چہیتا بن گیا تھا۔

یہ بہادر جوان دراصل حوال دار لالک جان تھے۔ ان کی اس بے مثال شجاعت اور بہادری پر حکومت پاکستان نے انھیں سب سے بڑا فوجی اعزاز ''نشان حیدر'' دیا۔ کارگل کی اس پوسٹ پر پاکستان کے صرف گیارہ جوانوں نے بھارت کی دو بڑی یونٹوں کو شکست فاش دے کر جنگ بدر کی یاد تازہ کر دی تھی۔

حوال دار لالک جان شہید ۱۹۶۷ء کو گلگت بلتستان کے ضلع ہندور کے ایک گاؤں یاسین میں نیت جان کے گھر پیدا ہوئے۔ جس دن وہ پیدا ہوئے اس دن ایک قریبی گاؤں مورنگ میں زبردست برفانی طوفان آیا، جسے بروشسکی زبان میں ''ووہٹ'' کہا جاتا ہے۔ یہ اتنا زوردار طوفان ہوتا ہے کہ اپنے ساتھ کئی ٹن وزنی پتھروں کو اُچھالتا ہوا دریا میں پھینک دیتا ہے۔ اسی واقعے کے پس منظر میں آپ کے نانا نے آپ کا نام ''ووہٹ'' تجویز کیا اور کہا: میرا نواسہ بڑا ہو کر ووہٹ کی طرح زوردار ہوگا اور کوئی بڑا کام کرے گا۔'' لیکن ان کے والد نیت جان نے اس تجویز سے اتفاق نہ کیا اور اُن کا نام ''لالی جان'' رکھا، جو بعد ازاں ''لالک جان'' معروف ہوا۔ انھوں نے اپنے دونوں ناموں کی لاج رکھی، ووہٹ جیسا کام بھی کیا اور ۷ جولائی ۱۹۹۹ء کو کارگل کے محاذ پر شہادت کا رتبہ پا کر پاکستان کے بہادروں کے چہیتے بھی بن گئے کہ جان قربان بھی کی تو ایسے کہ زندہ جاوید ہو گئے۔

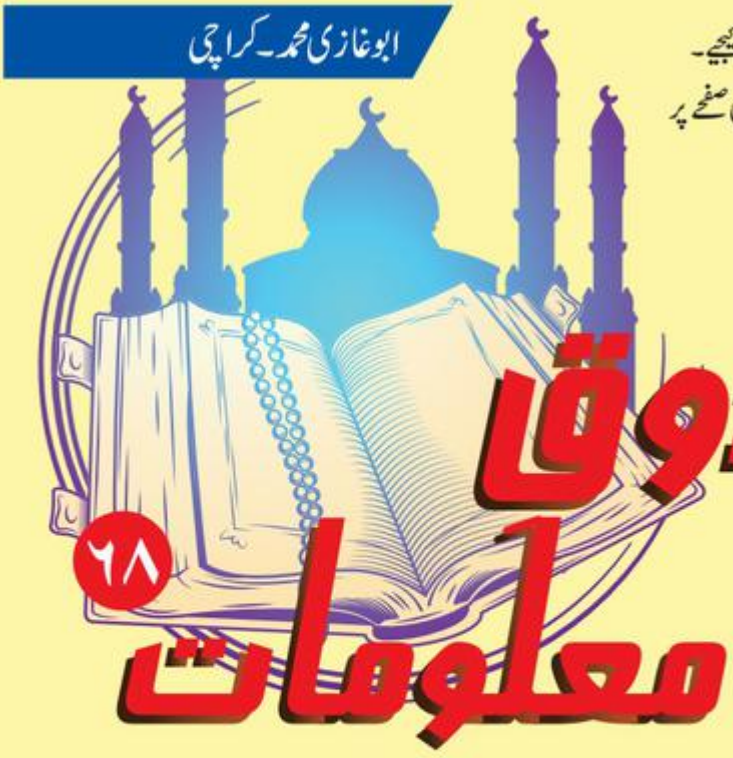

ابوغازی محمد۔ کراچی

یہ کُل پانچ اشارات ہیں۔ آپ ان کی مدد سے درست جواب تک پہنچنے کی کوشش کیجیے۔
اگر آپ ان اشارات کے ذریعے جواب تک پہنچ جائیں تو بُوجھا گیا جواب آخری صفحے پر موجود کوپن کے ساتھ ہمیں ارسال کر دیجیے اور اپنی معلومات کا انعام ہم سے پائیے۔
آپ کا جواب ۳۰ ستمبر تک ہمیں پہنچ جانا چاہیے۔

یہ کیا ہے؟

۱ یہ ایک پھل ہے جو پاکستان سمیت دنیا کے کئی ممالک میں پایا جاتا ہے۔
۲ اس پھل کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے۔
۳ اس پھل کی خاصیت سرد تر ہے۔
۴ یہ پھل جگر اور معدے کی کمزوری کو دور کر کے انھیں طاقت دیتا ہے۔
۵ اس پھل کا شربت فرحت بخش ہے۔ تمام صفراوی شکایات کو ختم کرتا ہے۔ قے، ہچکی، ابکائی اور کھٹی ڈکاروں کو روکتا ہے۔

اگلے دن قاسم اور صبوحی ایک گھنٹا پہلے ہی دادا جان کے کمرے میں پہنچ گئے۔

''دادا جان! ہم آج اس لیے جلدی آئے ہیں کہ کہیں ہمیں کہانی کے بیچ میں کل کی طرح نیند نہ آجائے!''

صبوحی نے جاگتے رہنے کا عزم کیا اور قاسم اسے دیکھ کر ہنسنے لگا۔

''دیکھ لینا، تم آج بھی سو جاؤ گی!''

''نہیں، آج تو سونا مشکل ہے، تمھارا بھی ہمارا بھی!''

صبوحی کی جگہ دادا جان نے جواب دیا۔

''کیوں دادا جان!؟''

قاسم نے پریشانی سے پوچھا۔

''اب کہانی ایسے موڑ پر آگئی ہے کہ آج رات میرا سونا تو ممکن نہ ہوگا۔''

دادا جان نے غمگین لہجے میں کہا۔

''کوئی بات نہیں! کل ہفتہ ہے، ابھی رات کو ہم سب جاگ لیں گے اور صبح سو جائیں گے۔''

صبوحی نے گویا مسئلہ حل کر دیا۔

''ہم یہاں تک پہنچے تھے کہ 1857ء میں انگریز جو بظاہر ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کے لوگ تھے، انھوں نے بنگال میں اپنی سیاست قائم کر لی۔''

قاسم نے جلدی جلدی یاد دِلایا۔

''دادا جان! 1857ء میں جو جنگ ہوئی تھی، جسے انگریز ''غدر'' کہتے ہیں، وہ کس کی کس کے ساتھ ہوئی تھی؟''

صبوحی نے بے چینی سے پوچھا۔

''یہ جنگ ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان ہوئی تھی۔ اصل میں تو انگریزوں نے ظلم مسلمانوں پر ہی کیا۔ ''بہادر'' اور ''سابق حکمران قوم'' ہونے کی وجہ سے سب الزام ہندوستانی مسلمانوں پر ڈالا گیا، بدترین مظالم ڈھائے گئے۔ اس جنگ میں سکھ اور مرہٹے خاموش الگ بیٹھے رہے۔

(کافی عرصے بعد اُنھیں یہ احساس ہوا تھا کہ انگریز ہمارے دوست نہیں، اقتدار کے لیے صرف خودغرض اور لالچی ہیں اور ہم مسلمانوں کی حکومت میں ذِمّی بن کر بہت زیادہ عزت اور آزادی سے رہ رہے تھے)۔

''دادا جان! ترتیب سے بتائیں۔ بنگال میں 1857ء میں انگریزوں نے اپنی سیاست قائم کر لی، پھر کیا ہوا؟''

قاسم نے بے چینی سے پوچھا۔

''ہاں، پھر سب کچھ بہت ہی بُرا ہوا۔ ایک وہ وقت تھا جب یہ انگریز جہانگیر کے دربار میں ''ایک تجارتی کوٹھی'' کی جگہ کے لیے ''بھیک'' مانگنے آئے تھے اور رواداری اور مہربانی کے جذبے سے انھیں ہر جگہ سہولت دی جا رہی تھی۔ ان کے ٹیکس بھی معاف تھے، مگر جب وہ اقتدار میں آئے تو اُنھوں نے اپنے سیاسی اقتدار سے فائدہ اُٹھا کر برطانوی مال ہندوستان میں کھپانا شروع کر دیا اور یہاں کا مال تباہ کرنے

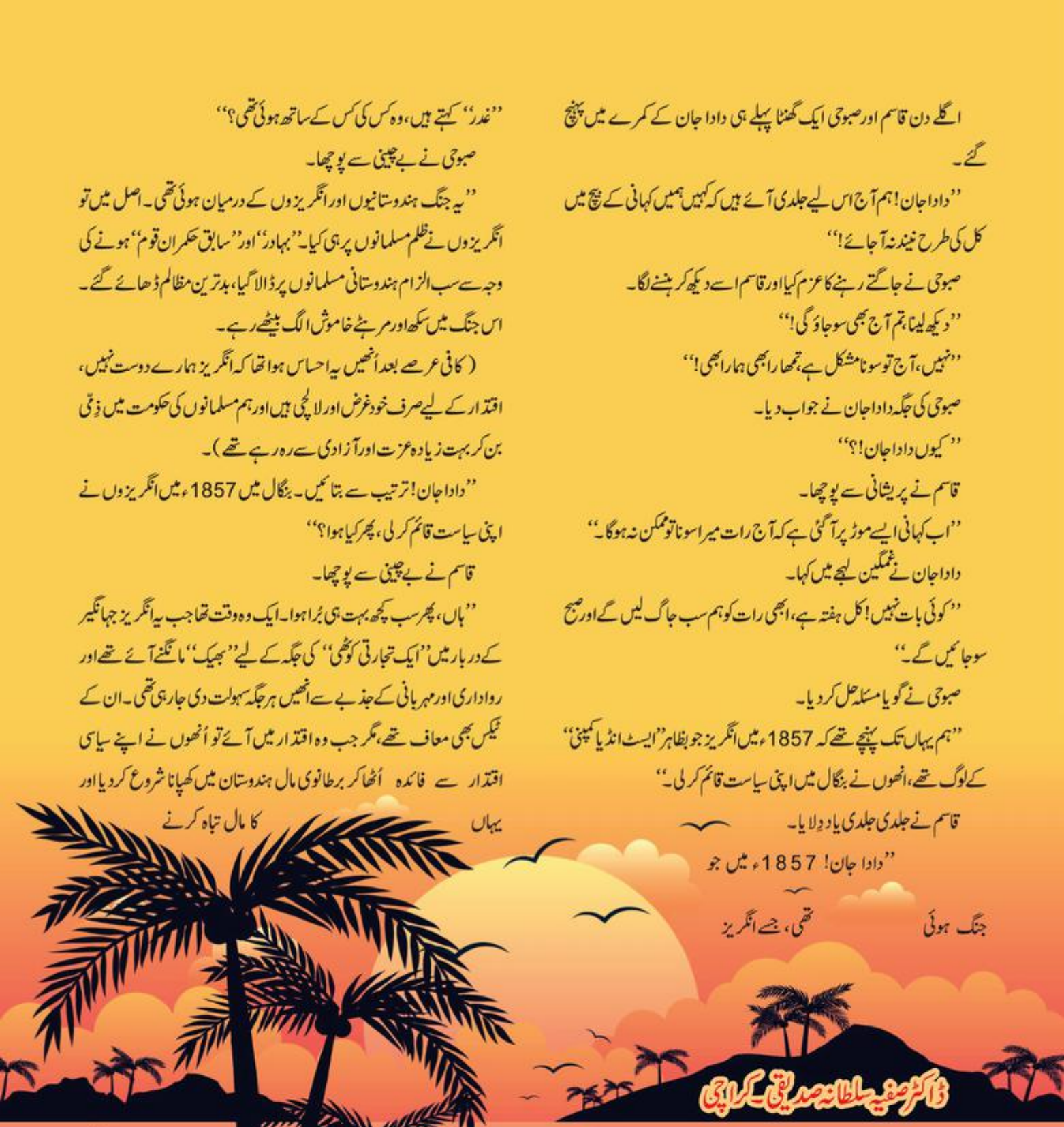

ڈاکٹر صفیہ سلطانہ صدیقی۔ کراچی

آزادی کا سورج ۲

کے لیے ظلم و تشدد کی انتہا کر دی۔ ہندوستان کی صنعت و زراعت تباہ کر دی۔ لوٹ مار کی جانے لگی۔ انگریز اور اُن کے ہندو ملازم اور چمچے، ذاتی تجارتیں کرنے لگے۔ ایسی چیزوں کا کاروبار بھی عام ہو گیا جو ممنوع تھیں۔ ان انگریزوں اور اُن کے چمچے ہندوؤں کی ذاتی اور نجی تجارت پر کوئی ٹیکس بھی نہ تھا۔

انگریز حکمران اور اُن کے ہندو چمچے کا روبار بڑھانے کے لیے ہر حد سے گزر گئے۔ وہ مَن مانی قیمت خود مقرر کر کے چیزیں خریدتے اور مسلمانوں کو بیچنے پر مجبور کر دیتے۔ جو مسلمان بات نہ مانتا اُس پر مقدمہ بناتے اور اُسے پھنسا دیتے، پھر خود ہی اس کا فیصلہ کر کے سزا کا عرصہ تجویز کر کے ان مسلمانوں کو جیل میں ڈال دیتے۔ مسلمان بدحال سے بدحال ہوتے گئے۔ وہ صنعت نہیں لگا سکتے تھے، صرف خام مال کی اجازت تھی، جو کوڑیوں کے مول انگریز خریدتے اور برطانیہ لے جاتے اور یوں انگریز امیر سے امیر ترین ہوتے گئے۔

''دادا جان! خام مال کیا ہوتا ہے؟''

صبوحی نے بیچ میں سوال کیا۔

''بیٹی! خام مال کا مطلب یہ تھا کہ جیسے ہند کے مسلمان گنّا کاشت کر سکتے تھے، مگر گُڑ اور چینی نہیں بنا سکتے تھے۔ کپاس لگا سکتے تھے، مگر روئی نہیں بنا سکتے تھے۔ گندم اُگا سکتے تھے، مگر آٹے کی مِل نہیں لگا سکتے تھے۔ اس طرح وہ بدحال اور فقیر ہو گئے۔''

''کیوں بھئی؟ کیوں نہیں لگا سکتے تھے؟ یہ کیا بات ہوئی؟''

صبوحی نے غصے سے کہا۔

''اس لیے کہ انھوں نے انگریزوں کو خود نادانی میں اپنے اوپر مسلّط کر لیا تھا۔ اب انگریز اتنے طاقت ور ہو گئے تھے کہ انھوں نے مسلمانوں کو ایک ایک روٹی حاصل کرنے کے لیے عاجز اور بے بس کر دیا تھا۔

رمیش چندرت نے لکھا ہے کہ ''ہندوستان سے جو کپڑا بھیجا جاتا اس پر بھاری ٹیکس لگائے جاتے اور جو کپڑا برطانیہ سے ہندوستان آتا اُس پر کوئی ٹیکس ہی نہ ہوتا تھا۔''

خود انگریز مؤرخین میں سے بعض، جیسے ''مِل'' اور ''جیمز'' نے لکھا ہے کہ 1813ء تک سوتی، ریشمی کپڑا برطانوی بازاروں میں معقول منافع کے ساتھ انگریزی کپڑے کے مقابلے میں پچاس، ساٹھ فی صد کم قیمت پر بکتا تھا، مگر انگریزوں نے اپنی ''صنعت'' بچانے کے لیے اپنے سیاسی اختیار کا ناجائز اِستعمال کیا۔ ہندوستانی کپڑے پر ستّر سے اسّی فی صد ٹیکس عائد کر دیا، تاکہ ہندوستانی لوگ وِلایتی کپڑے کی تجارت کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ اگر یہ ظالمانہ ٹیکس (ستّر، اسّی فی صد ٹیکس) ہندوستانیوں پر نہ لگایا جاتا تو ''مانچسٹر'' کے کارخانے شروع ہی میں بند ہو جاتے اور باوجود مشینوں کی قوت کے یہ کارخانے ہرگز ہرگز نہ چل سکتے تھے۔'' (جیمز، مِل)

دادا جان سانس لینے کے لیے رُکے اور پھر افسردگی سے بولے:

''میرے بچو! بھاری ٹیکس لگا کر انگریزوں نے مسلمان تاجروں کو مفلس کر دیا، پھر اپنے کارخانوں کے لیے ان سے خام مال حاصل کیا، جو وہ بغیر ٹیکس کے برطانوی کارخانوں تک دن رات پہنچا کر امیر سے امیر ترین ہوتے گئے۔ آخر کار مسلمانوں پر کپڑا بنانے پر پابندی لگا دی گئی۔ بہت سستے دام وہ صرف کپاس انگریز یا کالے انگریزوں (ہندوؤں) کے ہاتھ بیچ سکتے تھے۔ دوسری اشیا کی کاشت تو کر سکتے تھے، مگر پھر اِیسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال میں پورے کے پورے گاؤں اور رقبے ٹھیکے پر لینے شروع کر دیے، جو اُس وقت خوش حالی کا ذریعہ تھے اور ہندوستان کی جنت سمجھے جاتے تھے۔

1814ء میں برطانیہ کو ہندوستان سے پورے ''تیرہ لاکھ تھان'' کپڑا بھیجا گیا، جس کے مقابلے میں برطانیہ سے ہندوستان بھیجا جانے والا کپڑا ''سوا آٹھ لاکھ گز'' تھا، وہ بھی بھاری بھر کم ٹیکس کے ساتھ۔ غور سے سننا! تھان نہیں، بل کہ گز تھا، گز!''

''لوگ کہتے ہیں: ہم بے ایمان ہیں، ہم چور ہیں؟ دادا جان! یہ انگریز کتنے بڑے ڈاکو ہیں، کتنے بد دیانت ہیں؟ تھان لیے وہ بھی اس قدر اور بدلے میں اتنی بھاری رقم پر صرف ''سوا آٹھ لاکھ گز'' کپڑا آیا، وہ بھی اتنی مشکل سے اور اِس قدر ٹیکس کے ساتھ، پھر بھی لوگ انگریز کی تعریف کرتے ہیں! آخ تھو!''

قاسم نے نفرت سے کہا۔

''غلام ایسے ہی ہوتے ہیں بیٹے! انھیں اپنے آقا کے تمام کالے کام سنہرے نظر آتے ہیں!''

دادا جان نے کہا۔

''تم اس پر حیران ہو؟ یہ تو 1814ء کی بات ہے، مگر بیس برس کے بعد ہندوستانی کپڑا بھاری بھر کم ٹیکس کے ساتھ صرف تین لاکھ گز برطانیہ بھیجا گیا، جب کہ اس وقت انگلستان سے ہندوستان میں ''سوا چھے کروڑ'' گز کپڑا لایا گیا تھا۔'' (مِل، جیمز)

اس طرح کی دھاندلیوں سے وہ ڈھاکا جو کبھی سونا اُگلتا تھا اور اُس کی

آبادی دو لاکھ تھی، بیس برس بعد گھٹ کر صرف ستّر ہزار رہ گئی۔ جتنی تیزی سے آبادی ختم ہوئی، فاقے بڑھے اور غربت اور مفلسی کی زنجیروں میں مسلمان جکڑ کر رہ گئے۔ یہ 1834ء کے حالات ہیں میرے بچو!''

دادا جان نے غمگین ہو کر کہا۔

''کیا مسلمانوں نے حالات بدلنے کی کوشش نہیں کی؟''

غم زدہ آواز میں قاسم نے پوچھا۔

''عام مسلمان تو بے بس اور مایوس ہو چکے تھے، مگر سترھویں صدی میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے کھڑا کیا، لوگوں میں تبلیغ اور جہاد کی ہمت پیدا کرنے کے لیے۔ ان کے بعد اُن کے شاگرد یہ فریضہ انجام دیتے رہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ جیسے عالم، مبلغ، مجاہد کے بعد اُن کے پیروکار اُٹھے اور اُنھوں نے لاکھوں مسلمانوں میں جذبۂ جہاد پیدا کیا۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے سترھویں صدی میں دو مرتبہ افغانی مجاہد حکمران ''احمد شاہ ابدالی'' سے بھی مدد طلب کی تھی۔ ایک مرتبہ احمد شاہ ابدالی نے ان کی درخواست پر اورنگزیب کی وفات کے بعد مرہٹے قوم کا سر کچلا اور بدترین شکست دی تھی، دوسری مرتبہ سکھوں کے خلاف جنگ کر کے سکھوں کو شکست دی تھی۔ یہ 1871ء کی بات ہے، مگر احمد شاہ ابدالی کے جانے کے بعد پھر یہ فتنے اٹھ گئے۔''

''دادا جان! یہ جنگ کیسے چھڑ گئی تھی؟ یہ دوسری سکھوں والی جنگ؟''

صبوحی نے پوچھا۔

''سکھوں نے ظلم کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ انھوں نے تجارت اور اَجناس کی فروخت کی شرط یہ رکھی تھی کہ سو مسلمانوں کا سر کاٹ کر لاؤ تب ہم مال دیں گے۔ اس ظلم کے علاج کے لیے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے افغانی مجاہد حکمران ''احمد شاہ ابدالی'' کی مدد لی تھی۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے بعد اُن کے بیٹے اور پیروؤں نے تبلیغ اور جہاد کی تحریک کو زندہ رکھا، پھر ہندوستان میں سیّد احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی جہادی تحریک چلی۔ ان تحریکوں کے مجاہدین نے انگریزوں کو بدترین نقصان پہنچایا اور وہ عاجز ہو کر یہ سوچنے لگے کہ مسلمانوں کو لڑائی اور قتل سے تو ختم نہیں کیا جا سکتا، ان کا مستقل علاج کرنا ہوگا۔ ان کی قوت کو اور محبت اور اِتحاد کو توڑنا ہوگا۔''

''پھر اُنھوں نے کیا کیا؟''

قاسم نے گھبرا کر پوچھا۔

''ایک لمبے عرصے تک انھوں نے ایک نہیں، کئی سازشیں کیں اور سوئی ہوئی قوم بے خبری میں ماری جاتی رہی۔ یہ سلسلہ اگلی صدی تک انگریزوں نے جاری رکھا اور اب ہم خود اُن کے اس سلسلے کو چلا رہے ہیں۔''

دادا جان نے کہا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے تو دونوں بچوں نے ان کا چہرہ صاف کرنا شروع کر دیا۔

''دادا جان! میں آپ کو روتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔ آپ مجھے انگریز لڑکی اور بطخ کی کہانی ہی سنا دیں۔''

صبوحی نے معصومیت سے کہا۔

''نہیں، ہرگز نہیں! میں پوری کہانی ضرور سنوں گا، یہ سچی داستان ضرور معلوم کروں گا! ہمیں بھی تو معلوم ہو کہ ہمارے بادشاہوں کے حسنِ سلوک کے جواب میں کم ظرف انگریزوں نے کیا سلوک کیا تھا؟''

قاسم نے غصے اور نفرت سے کہا۔

دادا جان خود کو سنبھال کر دوبارہ گویا ہوئے:

''پہلے 1857ء کی جنگ کا حال سن لو، مجاہدین کے حملوں سے تنگ آ کر انگریزوں نے کہیں سے یہ فتویٰ لیا کہ انگریز کے خلاف جنگ کرنا جائز نہیں ہے۔''

''واہ! کیوں جائز نہیں ہے؟ وہ تو اتنے ظالم ہیں کہ اللہ کی پناہ!''

صبوحی نے چیخ کر کہا۔

''کیا مسلمانوں نے یہ فتویٰ مان لیا؟'' قاسم نے پوچھا۔

''کسی نے نہیں مانا۔ لوگ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی فکر، ان کی راہ نمائی اور سیّد احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے مجاہدانہ مشن پر چلتے رہے۔

انگریز نے اسلحہ اور طاقت کا ہر ممکن استعمال کیا، لیکن مجاہدوں کے حملوں کو نہیں روک سکا اور اُن کے حوصلوں کو پست نہیں کر سکا۔ سترھویں صدی کے آخر میں نواب سراج الدولہ جیسے عظیم مجاہد نے انگریزوں کا جینا حرام کر دیا۔ چناں چہ انگریز نے سازش کے ذریعے فتح حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔

انگریزوں نے سازش کی اور غدار پیدا کیے۔ میر جعفر سے رابطہ کیا اور کہا:

ہم تمھیں بنگال کا نواب بنائیں گے اگر تم سراج الدولہ کو مروا دو۔ میر جعفر کی مدد سے سراج الدولہ کو شہید کر دیا گیا۔ بزدل، سازشی انگریز، ٹیپو سلطان کے ساتھ جنگ میں بھی غداروں کے ذریعے ہی ٹیپو جیسے بہادر مجاہد اور شیر کو شہید کرنے میں کام یاب ہو سکے تھے۔ وہ ٹیپو سلطان سے اتنے خوف زدہ تھے کہ تین دن اُن کی لاش کے قریب آنے سے ڈرتے رہے کہ کہیں ٹیپو سلطان اُٹھ کر حملہ آور نہ ہو جائے!

سیّد احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے پیروؤں اور مجاہدین کو انگریز قوم نے غداروں کے ذریعے ختم کیا۔ آخر میں ایک مضبوط مورچہ سیّد احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے اہلِ خانہ کے علاقے ''دِیر'' میں تھا، جہاں سے وہ جہاد کی تیاریاں کیا کرتے تھے اور اُنھوں نے انگریز سفاک ظالم قوم کا جینا عذاب کر رکھا تھا۔ انھیں بے تحاشا نقصان پہنچایا تھا۔ سب مسلمان ان مجاہدین کے ساتھی اور حمایتی ہو گئے تھے۔

مگر مسلمانوں کی سزا اتنی جلدی کہاں ختم ہو سکتی تھی؟ جب کہ وہ خوش حالی اور غفلت کے دو سو سال گزار کر ایسے آرام طلب ہو چکے تھے کہ انھیں ہوش ہی نہیں آیا تھا کہ انگریز بدترین دشمن ہے، جسے جہانگیر اور شاہ جہاں نے اپنے دربار میں بلا کر مستحکم کیا تھا اور انگریز نام کی یہ دیمک ہندوستانی تخت و تاج میں لگا دی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ دو سو سال میں یہ انگریز پوری مسلم سلطنت کو تباہ و برباد کر دیں گے۔ یہ غفلت ہی کی سزا انھیں ملی تھی کہ انھوں نے دین ایمان والی زندگی چھوڑ کر عیش اور عشرت اور لاپرواہی و غفلت کی غیر مجاہدانہ زندگی اختیار کر لی تھی۔ دشمن ہمیشہ ایسے ہی ''بے خبر'' لوگوں پر حملہ کرتا ہے۔''

دادا جان نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ دونوں بچے گویا اپنی جگہ جم کر رہ گئے تھے۔

''دادا جان! ''دِیر'' کے مجاہدوں کے ساتھ انگریزوں نے کیا کیا؟''

قاسم دکھی ہو کر بولا۔

''انگریزوں نے فیصلہ کیا کہ بہت سا پیسا اور علاقے دے کر غدار خریدیں، تاکہ اسلامی جہاد ختم ہو سکے، چناں چہ انھوں نے خاصی کوشش کے بعد ''دِیر'' سے کچھ فاصلے پر ایسے غدار تلاش کر لیے جو انھیں دشوار ترین راستوں سے ''دِیر'' تک لے گئے، پھر انگریزوں نے دِیر میں آگ لگا دی۔ یوں اپنے راستے کی سب سے بڑی چٹان ہٹا دی اور مجاہدوں کا سب سے بڑا مورچہ ختم کر دیا۔

''دادا جان! انگریز اِتنے ظالم اور بدکردار کمینے لوگ ہیں، مگر اپنی قوم سے غداری کیوں نہیں کرتے تو ہماری قوم کیوں غداری کرتی ہے؟''

قاسم نے سوال کیا۔

''مال کا لالچ منافق قسم کے لوگوں کو اپنے مسلمان بھائیوں سے توڑ کر دشمن سے ملا دیتا ہے۔ وہ ہیرے، جواہرات اور زمینوں پر خوش ہوتے ہیں، مگر دشمن انھیں بھی کسی اور ذریعے ختم کر دیتا ہے۔ انگریزوں نے بہت سے غدار یہ کہہ کر مارے تھے کہ ''جو اپنی قوم کے نہ ہوئے وہ ہمارے کیوں اور کیسے ہوں گے؟''

دراصل یہ نام کے مسلمان وہ منافق لوگ ہوتے ہیں جنھیں نہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ سے پیار ہوتا ہے، نہ آخرت کی جواب دہی کا خوف۔ وہ مال کی محبت میں گرفتار ہو کر ہر اعلیٰ مقصد، بل کہ انسانیت کو بھی بھول جاتے ہیں۔ انگریز بھی دوسروں کے ملکوں میں آ کر متحد ہو کر رہتے ہیں، مگر اپنی قوم میں سب خود غرض اور ایک دوسرے سے بددِل ہوتے ہیں۔''

''دادا جان! اب یہ بتا بھی دیں ۱۸۵۷ء کہ کی جنگ کیسے ہوئی تھی؟ ورنہ میں سو جاؤں گی۔

صبوحی نے جھنجلا کر کہا۔ اُسے دراصل غداروں پر غصہ آ رہا تھا۔

.....(جاری ہے)

برسات

صاعقہ علی نوری۔ اسلام آباد

سورج نے منہ دکھایا
اُجلا سویرا لایا

پھل پھول دل لبھائیں
اشجار مسکرائیں

پنچھی بھی چہچہائیں
نغمے خوشی سے گائیں

سرگوشیاں ہیں کیسی
سرمستیوں کے جیسی

مغرب میں کچھ ہوا ہے
بادل نے بھی سنا ہے

رنگوں کے اڑتے گالے
مدھم ہوئے اجالے

اُجلا نیا سویرا
بادل نے آکے گھیرا

اندھیرا چھا رہا ہے
سورج بھی چھپ گیا ہے

چاروں طرف گھٹائیں
مستی میں سرسرائیں

سُر تال میں ہوا کے
خوش تالیاں بجاتے

شرمائے کھلکھلائے
وہ پتے مسکرائے

بادل کی ٹولیاں ہیں
جیسے سہیلیاں ہیں

لو سُرمئی گگن سے
اترے ہیں کیسے توشے

یہ ننھی ننھی بوندیں
ناچے ہیں مور جن میں

تیزی سے نیچے آئیں
رقصِ جنوں دکھائیں

باہر یا گھر کے اندر
جل تھل ہوا ہے منظر

سوال آدھا جواب آدھا

۲۴

الطاف حسین۔ کراچی

اس کھیل میں چند جملے ہیں، ہر جملہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں کچھ معلومات دی گئی ہیں، جب کہ دوسرے حصے میں اسی طرح کی معلومات آپ سے پوچھی گئی ہیں۔ آپ مطلوبہ معلومات ہمیں ۳۰ ستمبر تک ارسال کردیجیے، ہم آپ کو اس کا انعام روانہ کردیں گے۔ ایک سے زیادہ درست جوابات موصول ہونے کی صورت میں قرعہ اندازی کے ذریعے تین قارئین کرام کو انعام سے نوازا جائے گا۔ کوپن پُر کر کے ساتھ بھیجنا نہ بھولیے گا۔

۱ قرآن مجید میں پارہ نمبر 30 واحد پارہ ہے جو سب سے زیادہ رکوع (39 رکوع) پر مشتمل ہے...... بتائیے قرآن مجید کا وہ منفرد پارہ کون سا ہے جو 21 رکوع پر مشتمل ہے؟

۲ حضرت انس بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ احادیث نبویہ کی تعداد 1286 ہے...... بتائیے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعداد کتنی ہے؟

۳ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا تعلق قریش کی شاخ ''بنو تمیم'' سے تھا...... بتائیے خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ قریش کی کس شاخ سے تعلق رکھتے تھے؟

۴ میجر راجا عزیز بھٹی شہید (نشانِ حیدر) 12 ستمبر 1965ء کو ''برکی'' (لاہور سیکٹر) کے محاذ جنگ پر شہید ہوئے تھے...... بتائیے میجر شبیر شریف (نشانِ حیدر) کس محاذِ جنگ پر شہید ہوئے تھے؟

۵ ''دمبوواہ طائفہ'' کینیا کے قومی ترانے کا عنوان ہے...... کیا آپ جانتے ہیں کہ ''کیمرون'' کے قومی ترانے کا عنوان کیا ہے؟

۶ ''کراچی پورٹ'' پاکستان کی مشہور اور مصروف ترین بندرگاہ ہے...... بتائیے ''استنبول پورٹ'' کس ملک کی مشہور اور مصروف ترین بندرگاہ ہے؟

۷ ''کارتھیج انٹرنیشنل ایئرپورٹ'' تیونس کے شہر ''تیونس سٹی'' میں واقع ہے...... اگر کوئی جہاز ''حضرت شاہ جلال انٹرنیشنل ایئرپورٹ'' پر اُترے تو وہ بنگلہ دیش کے کس شہر میں ہوگا؟

۸ ''گھڑسال'' اصطبل کو کہتے ہیں؟...... آپ یہ بتائیے کہ ''گھڑمکھی'' کسے کہا جاتا ہے؟

۹ انسانی گروہوں سے تعلق رکھنے والے علم کو ''عمرانیات (Sociology)'' کہا جاتا ہے...... بتائیے انسان اور اُس کے کارناموں سے تعلق رکھنے والے علم کو کیا کہتے ہیں؟

۱۰ ''اندھا کیا جانے بسنت کی بہار'' اردو زبان کی ایک مشہور ضرب المثل ہے، جس کا مطلب ہے: ''جس میں تمیز کا مادہ نہ ہو وہ کسی چیز کی قدر نہیں کرتا''...... بتائیے ''اندھا کیا چاہے دو آنکھیں'' کا کیا مطلب ہے؟

کراچی کا تاج محل

رابعہ فاطمہ۔ کراچی

طارق صاحب کے اہلِ خانہ پانچ سال بعد پاکستان آئے تھے۔ وہ پچھلے کئی سالوں سے امریکا میں مقیم تھے۔ ہوائی اڈے پر اُترے تو اپنے چھوٹے بھائی مشتاق صاحب کو اپنا منتظر پایا۔ بڑے بھائی کا چھوٹے بھائی نے خیر مقدم کیا، پھر مشتاق صاحب نے سامان گاڑی میں رکھوایا اور سب گھر کی جانب روانہ ہوگئے۔

مشتاق صاحب گاڑی چلا رہے تھے کہ اتنے میں طارق صاحب نے ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے کہا:

''مشتاق! اپنے وطن کی بات ہی الگ ہے، کتنا سکون ہے یہاں!''

مشتاق صاحب اپنے بھائی کو پُرسکون دیکھ کر بہت مسرور تھے۔

طارق صاحب نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا:

''مشتاق! اس مرتبہ ہم پورے کراچی کی سیر کریں گے۔''

مشتاق صاحب نے مسکرا کر کہا:

''ضرور بھائی جان! اس مرتبہ ہم بچوں کو تاج محل بھی لے چلیں گے۔''

بچے جو بہت دیر سے بھائیوں کی محبت کو دیکھ رہے تھے اور اُن کی باتیں سن رہے تھے، چونک گئے اور سب کے منہ سے بے ساختہ نکلا:

''کیا!؟ تاج محل؟''

حمنہ جو طارق صاحب کی بڑی بیٹی تھی، کہنے لگی:

''لیکن چچا جان! تاج محل تو ہندوستان میں ہے نا!؟''

مشتاق صاحب نے اپنی نو سالہ بھتیجی کی بات کا جواب دیتے ہوئے پیار سے کہا:

''جی بیٹا! لیکن میں کراچی کے تاج محل کی بات کر رہا ہوں۔''

''کیا کراچی میں بھی تاج محل ہے چچا جان!؟''

حمنہ کی حیرت میں اضافہ ہونے لگا۔

''جی بیٹا! لو، گھر بھی آ گیا، اب باقی باتیں گھر میں کریں گے۔''

مشتاق صاحب نے حمنہ کی حیرانی کو بھانپتے ہوئے کہا۔

حمنہ نے مؤدبانہ انداز سے کہا:

''جی ضرور چچا جان!''

سب گاڑی سے اتر کر گھر کے دروازے کے پاس پہنچے۔ مہوش جو حمنہ سے ایک سال چھوٹی تھی، گھر کے آنگن میں لگے جھولے کو دیکھ خوشی سے اس کی طرف لپکی، باقی بچے بھی اس کے ساتھ کھیل کود میں شامل ہوگئے۔

.....☆.....

شام ہوئی تو سب چائے کے لیے جمع ہوئے۔

مشتاق صاحب نے اپنے بچوں اور طارق صاحب کے بچوں کو آواز دی:

''حمنہ، مہوش، فاطمہ، سعد! سب جلدی سے یہاں آؤ۔''

سارے بچے جو کھیلنے میں مصروف تھے، مشتاق صاحب کی آواز پر دوڑے چلے آئے۔

فاطمہ بولی:

''جی بابا جان!''

مہوش نے اپنے معصومانہ انداز میں کہا:

''ہم آ گئے چچا جان!''

مشتاق صاحب کو اپنی بھتیجی کا یہ انداز بہت پسند آیا اور اُسے پیار سے گود میں بٹھالیا، پھر کہنے لگے:

''ہم نے سوچا ہے کہ کل آپ سب کو کراچی کے تاج محل کی سیر کروائی جائے۔''

حمنہ بولی:

''جی چچا جان! وہی تاج محل جس کا آج صبح ہی آپ ذکر کر رہے تھے؟''

''جی بالکل!''

مشتاق صاحب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''چچا جان! وہاں جھولا ہوگا؟''

مہوش نے معصومیت سے پوچھا۔

''جھولا تو نہیں ہوگا، لیکن وہاں راجا ہوگا۔''

''راجا!؟'' سب بچے چونک پڑے۔

''جی، راجا۔'' مشتاق صاحب نے بچوں کے انداز میں ہی جواب دیا۔

''چلیں، میں آپ کو کراچی کے تاج محل کی کہانی سناتا ہوں۔''

سب بچے اطمینان سے بیٹھ گئے اور کراچی کے تاج محل کی کہانی سننے کے لیے بے تاب نظروں سے مشتاق صاحب کی جانب دیکھنے لگے۔

مشتاق صاحب نے کنکھارتے ہوئے کہانی کا آغاز کیا:

''ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک ہندو تاجر جس کا نام رائے بہادر شیورتن موہٹہ تھا، اپنی بیوی سے بے انتہا محبت کرتا تھا۔ ایک دن اس تاجر کی بیوی ایک مہلک بیماری کا شکار ہوگئی۔ لاکھ علاج کروایا، پر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ ماہر اَطبا کو دکھایا تو اُنھوں نے تاجر شیورتن موہٹہ کو مشورہ دیا کہ اگر آپ کی بیوی کو ساحل سمندر کے قریب رکھا جائے تو اُن کی صحت بہتر ہوجائے گی۔ شیورتن نے ایک محل نما گھر تعمیر کرنے کی ٹھان لی اور اُس نے ہمارے یہاں کلفٹن کے ساحل کے قریب ایک شان دار اور خوب صورت سا پیلس 1933ء میں تعمیر کروادیا۔ یہ پیلس ''موہٹہ پیلس'' کے نام سے جانا جانے لگا۔''

''اور بتایئے چچا جان!'' حمنہ نے بے تابی سے کہا۔

چچا بولے: ''باقی معلومات پیلس میں جا کر۔''

اور سب بچے آنے والے دن کا بے صبری سے انتظار کرنے لگے۔

.....☆.....

سہ پہر کے وقت تک تمام تیاریاں مکمل کرلی گئیں۔ مشتاق صاحب نے تمام سامان گاڑی میں رکھا اور سب سیر کے لیے روانہ ہوگئے۔ کچھ دیر بعد گاڑی کی رفتار تیز ہوگئی، ساتھ ساتھ بچوں کے دل بھی تیز تیز دھڑکنا شروع ہوگئے، کیوں کہ ان سب کا انتظار ختم ہونے والا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی سمندر نظر آنے لگا تو مشتاق صاحب نے کہا:

''بس اب ہم پہنچنے ہی والے ہیں۔''

جیسے ہی مشتاق صاحب نے گاڑی روک کر اُترنے کا کہا تو طارق صاحب نے بچوں کو ہدایت دیتے ہوئے کہا:

''آپ سب ہمارے ہاتھ تھام کر چلیں گے اور بغیر اِجازت کوئی کہیں نہیں جائے گا۔''

سب بچوں نے وعدہ کیا اور گاڑی سے اتر گئے۔ گاڑی سے اترتے ہی ایک شان دار نظارہ ان کا منتظر تھا۔ نہایت خوب صورت پیلس ان سب کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ سب کو یوں لگا کہ جیسے وہ پیلس نہیں، کوئی راجھستانی محل ہے۔

مشتاق صاحب نے کہا:

''بچو! آپ نے تاجر شیورتن موہٹہ کی کہانی تو کل سُن لی تھی، اب آپ سب کو اِس عمارت کے بارے میں بتاتا ہوں۔ شیورتن نے اس پیلس کو بالکل اپنے راجھستانی محل کے جیسا بنوایا۔ اس عمارت کے معمار کا نام آغا احمد حسین تھا، جو کہ مسلمان تھا۔ یہ پیلس تعمیر تو 1933ء میں ہوا تھا، لیکن اس کے نقش ونگار، گنبد اور مینار ہمیں مغلیہ دور میں لے جاتے ہیں۔''

سب محل کے اندر داخل ہوئے۔ عمارت کی تعمیر اور دل کشی کو دیکھ کر سب دنگ رہ گئے۔ حمنہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا:

''اس مینار کے نقش ونگار کتنے خوب صورت ہیں۔''

فاطمہ نے کہا:

''اس دیوار کو دیکھو ذرا! اس پر کتنے خوب صورت پرندے بنے ہوئے ہیں۔''

سب نے اس دو منزلہ اور سولہ کمروں پر مشتمل پیلس کو اپنی آنکھوں سے اپنی یادداشت میں قید کرلیا۔ مختلف جگہ پر اُنھوں نے پیلس کی کچھ تصویریں بھی کھینچیں۔

.....☆.....

عمارت کے اطراف میں موجود باغیچے میں مشتاق صاحب اور طارق صاحب کے اہلِ خانہ بیٹھ گئے اور اِس خوب صورت تاج محل کا نظارہ کرنے لگے۔ مشتاق صاحب نے اپنی کہانی کو اختتام تک پہنچاتے ہوئے بچوں کو بتایا:

''تقسیم ہند کے بعد، پہلے یہ پیلس ایک سرکاری دفتر میں تبدیل کردیا گیا تھا، پھر بعد میں فاطمہ جناح کو یہ پیلس بمبئی میں ان کے گھر کے بدلے میں ملا، اس لیے اسے قصرِ فاطمہ بھی کہا جاتا ہے۔ موہٹہ پیلس کی چھت سے آج بھی سمندر نظر آتا ہے۔'' مشتاق صاحب نے بات کو جاری رکھتے ہوئے:

''لو بھئی، کہانی ختم، پیسا ہضم!''

سب مشتاق صاحب کی بات پر ہنسنے لگے اور تاریخ ساز موہٹہ پیلس کی سیر کر کے گھر کی جانب روانہ ہوگئے۔

بُری بات

شاہد اقبال۔ گوجرانوالہ

جب احمد میاں دوسری جماعت کے طالب علم تھے، عمر یہی کوئی سات آٹھ سال ہوگی، اس وقت یوں تو احمد میاں اپنی جماعت کے ہونہار طالب علم تھے، مگر اُن میں ایک بُری عادت تھی۔ اسکول جاتے ہوئے وہ اپنے باغیچے میں سے ضرور گزرتے، جہاں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے ہوتے۔ کہیں گیندے کا پھول اپنی بہار دِکھلا رہا ہوتا تو کہیں موتیا اپنی چاندنی بکھیر رہا ہوتا۔ گلاب کے پھولوں کی تو اپنی ہی دنیا تھی، سرخ، گلابی، سفید رنگوں والے گلاب مسکراتے ہوئے احمد میاں کو خوش آمدید کہتے، مگر احمد میاں انھیں نوچ نوچ کر پھینک دیتے، کسی کو توڑ کر مسل دیتے، کسی پھول کو توڑ کر پتی پتی کر کے بکھیر دیتے اور کسی پھول کو توڑ کر اپنی کتاب یا کاپی میں قید کر لیتے، اور تو اور، ہری ہری گھاس کو بھی روندتے ہوئے گزر جاتے۔ اس بُری عادت کو ختم کرنے کے لیے ان کی والدہ نے بہت کوشش کی، مگر احمد میاں ٹس سے مس نہ ہوئے۔

''اماں! مجھے مت روکیں، مجھے اسی طرح کھیلنا اچھا لگتا ہے۔''

''ہائیں! یہ بھی بھلا کوئی کھیل ہے! یہ پھول پودے بھی تو جان دار ہیں۔ انھیں بھی تو تکلیف ہوتی ہوگی، اور پھر باغ کی خوب صورتی بھی تو خراب ہوتی ہے۔''

والدہ نے پیار سے سمجھایا، مگر احمد میاں نے ہمیشہ کی طرح ایک کان سے سُن کر دوسرے کان سے نکال دیا۔

ایک دن ان کی اُستانی نے بتایا:

''پھول پودے بھی جان دار ہوتے ہیں۔ انسانی زندگی کے لیے پودے بے حد ضروری ہیں، اس لیے ان کی دیکھ بھال کرنا ہمارا فرض ہے۔ زندگی میں جیسے پانی اور ہوا لازمی ہیں اسی طرح پودے اور درخت ہمیں آکسیجن فراہم کرتے ہیں، جو ہمارے زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے۔''

احمد میاں کو اُستانی کی باتیں کچھ کچھ سمجھ میں آئی تھیں۔

''لیکن میں صرف پھول ہی تو توڑتا ہوں، کون سا پورا پودا زمین سے اُکھاڑ دیتا ہوں۔'' احمد میاں نے خود کو تسلی دی اور اپنے کام میں مگن رہے۔ چند دِن بعد اتوار تھا اور اِسکول کی چھٹی ہوتی تھی۔

اس روز احمد میاں کی گویا عید ہوتی تھی، وہ چپکے چپکے باغیچے میں جاتے اور کافی دیر تک اپنے ''کھیل'' میں مشغول رہتے۔

لیکن آج جوں ہی وہ اندر داخل ہوئے حیرت زدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ آج تمام پھول پہلے سے زیادہ ہوئے نکھرے نظر آرہے تھے، کل کے ٹوٹے ہوئے پھول بھی غائب تھے۔

جیسے ہی احمد میاں نے ایک سفید گلاب کی طرف ہاتھ بڑھایا ان کے ہاتھ پر ایک جھٹکا سا لگا۔ انھیں لگا جیسے پھول نے ان کے ہاتھ پر کاٹا ہو، پورا ہاتھ جلنے لگا۔

''یہ کیا!؟'' انھوں نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا۔

اب احمد میاں کا رُخ سورج مکھی کی طرف تھا۔ سورج مکھی کے پھول نے ان کی گردن پر اچانک وار کیا۔ گردن پر جیسے آگ سی لگ گئی۔ احمد میاں بہت پریشان تھے کہ یہ آج کیا ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتے، گُلِ لالہ، موتیا، چنبیلی اور رات کی رانی، سب پھول ایک ساتھ ان پر حملہ آور ہوئے اور نہ جانے کہاں سے ایک درخت کی شاخوں سے بنی ہوئی رسی نے ان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ یہ سب چند لمحوں میں ہی ہو گیا تھا۔ اب احمد میاں خوف زدہ ہو کر بُری طرح چیخنے لگے، مگر یہ کیا!؟ ان کی تو آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔

رسی نے انھیں گھسیٹنا شروع کیا تو احمد میاں بہت ڈر گئے، وہ دل ہی دل میں اپنے رب سے معافی مانگنے لگے:

''اللہ میاں جی! میں اب ہرگز پھول نہیں توڑوں گا، وہ بھی تو جان دار ہیں۔ ایک بار میری توبہ قبول کر لیں۔''

آنکھوں میں آنسو تھے اور احمد میاں ہچکیوں سے رو رہے تھے۔

''ارے بیٹا! اُٹھو، کیا ہوا؟ کیوں رو رہے ہو؟ کیا کوئی بُرا خواب دیکھ لیا ہے؟''

والدہ نے ان کے گالوں کو تھپ تھپایا تو احمد میاں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔

''اوہ! تو یہ سب خواب تھا، ایک بُرا خواب۔''

خوف سے ایک مرتبہ پھر احمد میاں نے آنکھیں بند کر لیں۔

''اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول کر لی۔ اب میں کبھی بھی پھولوں اور پودوں کو تکلیف نہیں دوں گا۔''

احمد میاں نے والدہ کی گود میں سر چھپا لیا اور والدہ دھیمے سے مسکرا دیں۔ ان کی کچھ کچھ سمجھ میں آ گیا تھا کہ ان کے بیٹے کو دُرست سمت کا پتا چل گیا ہے، اب اس کی بُری عادت ختم ہو جائے گی۔ انھوں نے محبت سے احمد کو گلے سے لگا لیا۔

جھوٹوں کے جھوٹے ۲۰

۶۔ حارث دمشقی

حافظ محمد دانش عارفین حیرت۔ لاہور

اس کا نام حارث بن عبدالرحمن بن سعید تھا۔ وہ دمشق کا رہنے والا تھا۔ کسی دھوکے باز نے دھوکے سے اسے غلام بنالیا اور ایک قریشی ابوجلاس عبدی کے ہاتھ فروخت کردیا۔

اس زمانے میں غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے ایک طریقہ یہ بھی ہوتا تھا کہ اگر وہ ایک مقررہ رقم اپنے مالک کو ادا کردیں تو انھیں آزاد کردیا جائے گا۔

حارث نے بھی اپنے مالک سے معاملہ طے کیا اور آزاد ہوگیا۔ آزاد ہونے کے بعد اُس کے پاس کوئی خاص کام نہیں تھا اور نہ ہی زندگی جینے کے لیے اس نے کچھ سوچ رکھا تھا۔

اس نے کچھ اہل اللہ کو دیکھا کہ وہ دن رات صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت میں ہی مصروف رہتے ہیں۔ اپنے کاموں کے لیے اللہ تعالیٰ سے ہی مدد مانگتے ہیں۔

ایسے لوگوں کو بزرگان دین یا درویش کہتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے بھی کہلاتے ہیں۔ یہ بزرگ چوں کہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ بھی ان سے محبت کرتے ہیں، یہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ صرف خود اُن سے محبت کرتے ہیں، بل کہ اپنی مخلوق کے دل میں بھی ایسے لوگوں کی محبت پیدا فرمادیتے ہیں۔

ایسے بزرگان دین کو دیکھ کر حارث کے دل میں بھی اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے اور اُس کی عبادت کرنے کے شوق نے انگڑائی لی۔ چناں چہ اس نے ایسا ہی کیا اور اپنے اس شوق کو پورا کرنے کے لیے دن رات اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہنے لگا۔ کم کھانا کھاتا، تاکہ زندہ رہے اور بیمار ہوکر مر نہ جائے۔ کم سوتا اور بات چیت بھی کم کرتا۔

حارث دنیا سے بالکل الگ تھلگ رہنے لگا، اس نے لوگوں سے ملنا جلنا بالکل ہی چھوڑ دیا اور اکیلا رہنے لگا۔ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہتا اور اپنے کام سے کام رکھتا۔

جب بھی کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے اور اُس کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو شیطان جل بھن جاتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اس شخص کو سیدھے راستے سے ہٹادے، کیوں کہ شیطان، انسان کا ازلی دشمن ہے، لہٰذا جب اس نے حارث کذاب دمشقی کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے دیکھا تو فوراً اُسے بہکانے کے لیے اس کے پاس پہنچ گیا۔ شیطان اکثر ایسا ہی کرتا ہے۔

شیطان نے جب حارث دمشقی کو سیدھے راستے سے بھٹکانے کی کوشش شروع کی تو اُس نے حارث سے دوستی کرکے اسے ایسی ایسی چیزیں دکھانی شروع کیں کہ اس سے پہلے حارث نے وہ چیزیں کبھی نہیں دیکھی تھیں۔

وہ کسی سے ملتا جلتا بھی نہیں تھا کہ ان چیزوں کے بارے میں اپنے کسی دوست وغیرہ سے دریافت کرتا یا کسی بزرگ سے مل کر انھیں اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات کے بارے میں بتا کر راہ نمائی حاصل کرتا۔

حارث کو اُن چیزوں کے متعلق بالکل علم نہیں تھا۔ اس نے اپنے والد عبدالرحمن کو خط لکھا:

''آپ فوراً میرے پاس آجائیں۔ مجھے کچھ ایسی چیزیں دکھائی دے رہی ہیں جن کے متعلق مجھے خوف ہے کہ یہ چیزیں شیطان کی طرف سے نہ ہوں۔''

عبدالرحمن ان دنوں حولہ کے مقام پر رہتا تھا۔ اسے جب اپنے بیٹے کا خط ملا تو اُس نے اپنے بیٹے کو تنبیہ کرنے اور شیطان کے شر سے بچانے کی کوشش کرنے کے بجائے یہ لکھ بھیجا:

''بیٹا! تم جو کام کر رہے ہو اُس کام کو بے خوف و خطر کرتے رہو، کیوں کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں:

'کیا میں تمھیں بتاؤں کہ شیاطین کس پر اُترتے ہیں؟ وہ ایسے لوگوں پر اُترتے ہیں جو جھوٹے اور گناہ گار ہیں۔'

(الشعراء: 221،222)

اور تم نہ تو جھوٹے ہو اور نہ ہی گناہ گار ہو، اس لیے کسی قسم کے وسوسے کو اپنے دل میں نہ آنے دو۔''

حارث کو اپنے والد کا یہ خط ملا تو وہ مطمئن ہو گیا اور اُس نے شیطان سے دوستی کرتے ہوئے ان چیزوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عنایت سمجھ لیا۔

حارث کے والد عبدالرحمن کا اس آیت کو حارث کے ساتھ پیش آنے والے واقعات پر منطق کرنا بالکل غلط تھا، کیوں کہ اس سے اگلی آیت سے ہی ہمیں یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ آیت نجومیوں اور جھوٹے کاہنوں کے لیے ہے، جو شیطانوں سے کوئی بات سن کر جھوٹی اور سنی سنائی بات آگے پہنچاتے ہیں۔

حارث چوں کہ کم کھاتا، کم سوتا، کم بات کرتا تھا اور اُس نے اپنی زندگی بھی سخت، زاہدوں جیسی اور مشقت والی بنا رکھی تھی، اس لیے حارث سے استدراج اور جادو جیسے افعال صادر ہونے لگے۔ چناں چہ وہ مسجد میں بیٹھ کر کسی پتھر پر اُنگلی مارتا تو وہ پتھر تسبیح پڑھنے لگتا۔ یہ عمل سامری کے سونا چاندی کا بچھڑا بنانے والے عمل جیسا ہی تھا۔

اسی طرح حارث لوگوں کو سخت سردی کے موسم میں گرمیوں کے پھل کھلاتا اور سخت گرمی میں سردیوں کے پھل پیش کر دیتا۔ ظاہر ہے کہ یہ پھل اسے شیطان ہی لا کر دیتا تھا۔ کبھی وہ اپنی مجلس میں حاضر ہونے والے لوگوں سے کہتا:

''آؤ، آج میں تمھیں دمشق سے فرشتے جاتے ہوئے دکھاؤں۔''

اس کے بعد وہ انگلی سے ایک طرف اشارہ کرتا اور حاضرین مجلس اس طرف دیکھ کر محسوس کرتے کہ نہایت ہی خوب صورت اور حسین و جمیل فرشتے انسانوں کی شکل میں گھوڑوں پر بیٹھ کر جا رہے ہیں۔

شیخ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''الفرقان بین اولیاء الرحمن و اولیاء الشیطان'' میں لکھا ہے کہ ''حارث نے لوگوں کو جو گھڑ سوار دکھائے تھے، وہ ملائکہ نہیں جنات تھے۔''

بہر حال، لوگوں میں اس کے ان استدراج اور جادو بھرے اعمال کی گونج سنائی دینے لگی تو اُس نے دعویٰ کر دیا:

''میں اللہ کا نبی ہوں۔''

ظاہر ہے کہ اسے یہ پٹی بھی شیطان نے ہی پڑھائی تھی۔ اس نے بہت سے نیک لوگوں کو اِس جیسی پٹی پڑھا کر گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے، مگر وہ نیک لوگ اللہ کے کرم اور اُس کی محبت کے باعث شیطان کے ہاتھوں گمراہ ہونے سے بچ گئے۔

مگر حارث چوں کہ قرآن مجید کی آیت ''اہل علم سے پوچھ لیا کرو'' کے مطابق اہلِ علم سے دریافت نہیں کرتا تھا، اس لیے اس نے شیطان کی طرف سے نبی ہونے کے خیال پر یقین کر لیا اور اُس کا پرچار کرنے لگا۔

جب حارث کذاب دمشقی کے جادوئی کمالات نے شہرت اختیار کر لی تو دمشق کے ایک رئیس قاسم بن بخیم نے اس سے ملاقات کی اور پوچھا:

''تم کس چیز کا دعویٰ کرتے ہو؟''

حارث کذاب دمشقی نے جھوٹ سے بھرا ہوا جواب دیا:

''میں اللہ کا نبی ہوں۔''

قاسم ایک سچا مسلمان تھا اور خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کی نبوت پر کامل یقین رکھتا تھا۔ اس نے فوراً کہا:

''اے اللہ کے دشمن! تُو نبی نہیں ہے، بل کہ تُو جھوٹا ہے، کیوں کہ خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے۔''

حارث کذاب کی آنکھوں پر شیطان نے پوری طرح پٹی باندھ رکھی تھی، اس لیے اس نے قاسم کی باتوں پر بالکل بھی کان نہیں دھرے اور لوگوں کو گمراہ کرنے میں لگا رہا۔

قاسم نے جب دیکھا کہ حارث پر اُس کی بات کا کچھ اثر نہیں ہوا تو وہ سیدھا خلیفہ کے پاس جا پہنچا۔ ان دنوں عبدالملک بن مروان مسلمانوں کے خلیفہ تھے۔ قاسم نے خلیفہ عبدالملک بن مروان سے ملاقات کی اور اُنھیں حارث کی فتنہ انگیزی کے بارے میں بتایا۔ قاسم بن بخیم ایک عزت دار رئیس تھا۔ خلیفہ عبدالملک نے اس کی بات سن کر حکم دیا:

''حارث کو گرفتار کر کے میرے سامنے پیش کیا جائے۔''

پولیس نے خلیفہ کے حکم پر حارث کو گرفتار کرنے کے لیے اس کے گھر پر چھاپا مارا تو وہاں اس کا سراغ نہیں مل سکا۔ اصل میں حارث کو قاسم کی باتوں سے خطرے کی بُو آ گئی تھی، اس لیے وہ وہاں سے فرار ہو گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حارث کو اُس کی خدمت پر مامور شیاطین نے اطلاع دے دی

ہو کہ قاسم نے خلیفہ سے تمھاری شکایت لگائی ہے، اس لیے وہ وہاں سے فرار ہو گیا ہو۔

بہر حال، جو بھی ہوا، فرار ہو کر اُس نے بیت المقدس میں پناہ لی اور وہاں خفیہ طور پر اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہو گیا۔

بیت المقدس پہنچ کر حارث کے ماننے والے وہاں پر ایسے لوگوں کو تلاش کرتے جو اللہ تعالیٰ سے لَو لگانے کے خواہش مند ہوں۔ انھیں جیسے ہی ایسا کوئی شخص ملتا وہ اسے گھیر کر حارث کے پاس لے جاتے۔ حارث انھیں اپنے شیطانی شعبدے دکھاتا جنھیں وہ لوگ اپنی کم علمی کے باعث نورانی کرامت سمجھ کر حارث سے متاثر ہو جاتے اور اُس سے بیعت کر لیتے۔

ایک مرتبہ حارث کے ماننے والے ایک بصری کو لے کر آئے۔ یہ بصری شخص بیت المقدس میں نیا نیا آیا تھا۔ اس نے جب حارث کے بارے میں سنا تو بہت متاثر ہوا۔ اس نے حارث کی حقیقت جاننے کے لیے اس سے بات کی۔ باتوں باتوں میں حارث نے اسے بتایا:

''میں نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔''

دراصل یہ بصری شخص خلیفہ عبدالملک بن مروان کا جاسوس تھا۔ حارث کی بات سُن کر بصری شخص کو یقین ہو گیا کہ یہ شخص جھوٹا ہے۔ اس نے حارث سے کہا:

''آپ کی ہر بات بہت پیاری اور پسندیدہ ہے، لیکن آپ کے دعویٰ نبوت کو ماننے میں مجھے کچھ غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔''

حارث کذاب دمشقی نے کہا:

''کوئی جلدی نہیں ہے، تم اچھی طرح سوچ بچار کر لو۔''

بصری وہاں سے اس کی نبوت کا اقرار کیے بغیر چلا گیا۔ اگلے روز وہ پھر آیا اور کہنے لگا:

''میں نے آپ کی باتوں پر بہت غور کیا ہے، مجھے آپ کی باتیں بہت دل چسپ اور من پسند لگی ہیں۔ آپ کا کلام بھی بہت عمدہ ہے۔ میں آپ پر اور آپ کے سچے دین پر ایمان لاتا ہوں۔''

اس کے بعد وہ بصری شخص حارث کذاب دمشقی کی جماعت میں شامل ہو گیا۔ جماعت میں شامل ہو کر وہ جلد ہی حارث کے قریبی لوگوں میں شمار ہونے لگا۔ اس نے حارث کے قریب ہو کر اُس کے تمام معمولات کا پتا لگایا اور تمام حالات معلوم کیے۔ جب اسے سب معلوم ہو گیا تو وہ ایک روز حارث کے پاس آیا اور کہنے لگا:

''یا نبی! میں بصرہ کا رہنے والا ہوں۔ اتفاق سے بیت المقدس آیا تو آپ سے ملاقات ہو گئی اور مجھے ایمان کی دولت مل گئی۔ اب میں چاہتا ہوں کہ بصرہ واپس جاؤں اور وہاں جا کر لوگوں کو آپ کی نبوت کی دعوت دوں۔''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں!'' حارث کذاب دمشقی نے جواب دیا:

''تم ضرور اپنے وطن واپس جا کر اس مقدس خدمت کو انجام دو۔''

اور بصری شخص کو جانے کی اجازت دے دی۔

حارث سے اجازت ملتے ہی بصری شخص فوراً وہاں سے روانہ ہوا اور معلوم کیا کہ خلیفہ عبدالملک بن مروان کہاں ہیں؟ جلد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ وہ صنبرہ میں ہیں۔ اس نے فوراً سفر کا سامان باندھا اور خلیفہ کے پاس پہنچ گیا۔

خلیفہ نے فوراً ہی اسے اپنے پاس بلوا لیا اور پوچھا:

''حارث کہاں ہے؟''

''وہ بیت المقدس میں فلاں جگہ چھپا ہوا ہے۔'' بصری نے خلیفہ کو سارے حالات بتائے اور آخر میں کہنے لگا:

''اگر آپ میرے ساتھ چند سپاہی کر دیں تو میں بآسانی اسے پکڑ کر آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں۔''

خلفیہ عبدالملک بن مروان نے فوراً چالیس قابل سپاہی، بصری کی کمان میں دے دیے اور اُن سپاہیوں کو حکم دیا:

''اس کے ہر حکم کی تعمیل کریں۔''

اس کے ساتھ ساتھ خلیفہ نے بیت المقدس میں موجود اپنے عامل کے نام ایک فرمان لکھوایا کہ اس بصری شخص کی ہر قسم کی مدد کی جائے۔

خلیفہ کے بصری جاسوس نے سپاہیوں کو ساتھ لیا اور بیت المقدس پہنچ گیا۔ جس وقت یہ لوگ بیت المقدس پہنچے اس وقت رات ہو چکی تھی۔ بصری جاسوس نے موقع غنیمت جانا اور حارث کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔

''تم باہر ہی رکو، میں جب بلاؤں تب اندر آنا۔''

بصری جاسوس نے سپاہیوں کو باہر ہی چھپنے کا کہا اور خود اُندر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا۔

بصری جب اندر جانے لگا تو حارث کے دربان نے بصری کو اُندر جانے سے منع کیا:

''تم حضرت کے خاص خادموں میں سے ہو، لیکن اس کے باوجود اس وقت تمھیں اندر جانے کی قطعی اجازت نہیں ہے۔''

بصری نے اپنی باتوں سے کام چلایا اور دربان کو راضی کیا کہ وہ اس کے لیے دروازہ کھول دے۔ دربان اس کی باتوں میں آ گیا اور دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی بصری جاسوس نے سپاہیوں کو اندر آنے کے لیے زور سے آواز لگائی:

''سپاہیو! اندر آ جاؤ۔''

سپاہی تو پہلے ہی تیار کھڑے اشارے کا انتظار کر رہے تھے، آواز سنتے ہی وہ بلا تاخیر اندر داخل ہو گئے۔ سپاہیوں کو دیکھ کر دربان اور حارث کے دیگر مریدوں کے ہوش اڑ گئے، انھوں نے شور مچا دیا۔

ان میں سے ایک چلا کر کہنے لگا:

''افسوس! تم ایک اللہ کے نبی کو قتل کرنا چاہتے ہو، جسے اللہ تعالیٰ نے آسمان پر اُٹھا لیا ہے۔''

یہ جملہ دراصل حارث کذاب دمشقی کو خطرے کا اشارہ دینے کے لیے تھا۔ حارث فوراً ہی ایک خفیہ جگہ پر چھپ گیا۔ یہ خفیہ جگہ اس کے مریدوں نے ایسے ہی کسی وقت کے لیے تیار کروائی تھی۔ سپاہی جب اندر پہنچے تو کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ انھوں نے چاروں طرف دیکھا، لیکن وہاں انھیں کوئی نظر نہیں آیا۔

''اندر کوئی نہیں ہے جناب!''

ایک سپاہی نے بصری جاسوس کو اِطلاع دی۔

بصری جاسوس سے تو کوئی بھی بات چھپی ہوئی نہیں تھی، وہ تو ساری معلومات اکٹھی کر کے پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا۔

اس نے خود تلاشی لینی شروع کی۔ جلد ہی ایک خفیہ جگہ کی تلاشی لیتے ہوئے اس کے ہاتھ حارث کذاب دمشقی کے کپڑوں کو لگے۔ اس نے حارث کے کپڑے پکڑ کر اُسے باہر کھینچ لیا اور سپاہیوں کو حکم دیا:

''گرفتار کر لو اِس ملعون شخص کو۔''

سپاہیوں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور حارث کو بیڑیوں میں جکڑ لیا۔

جلد ہی وہ لوگ حارث کو لے کر خلیفہ عبدالملک بن مروان کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں حارث نے اپنا جادو دِکھایا اور اُس کے جسم پر بندھی زنجیریں ٹوٹ کر گر گئیں۔ سپاہیوں نے دوبارہ اسے زنجیروں سے باندھ دیا، مگر وہ پھر کُھل کر گر گئیں۔ سپاہیوں نے اسے تیسری بار پھر باندھ دیا۔

اس کی زنجیریں کھلتی دیکھ کر اُس کے مریدین جو ساتھ ہی آ رہے تھے، خوش ہونے لگے، لیکن بصری جاسوس اس کے اس مافوق الفطرت شعبدے سے بالکل بھی متاثر نہیں ہوا۔

شیخ ابن تیمیہ نے اپنی کتاب ''الفرقان بین اولیاء الرحمن و اولیاء الشیطان'' میں لکھا ہے کہ ''حارث کی ہتھکڑیاں کھولنے والے کوئی اور نہیں، بل کہ اس کے شیطان دوست تھے۔''

بہر حال، اسے خلیفہ عبدالملک بن مروان کے سامنے پیش کیا گیا۔

''کیا تم واقعی نبوت کے دعوے دار ہو؟''

خلیفہ عبدالملک بن مروان نے حارث سے پوچھا۔

''ہاں۔'' حارث نے جواب دیا:

''لیکن یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ میں جو کچھ کہتا ہوں وحی کی نسبت سے کہتا ہوں۔''

حارث کا جواب سن کر خلیفہ عبدالملک بن مروان نے ایک بڑے قد کے طاقت وَر محافظ کو حکم دیا:

''اس (بدبخت انسان) کو نیزہ مار کر ہلاک کر دو۔''

محافظ نے حارث کو نیزہ مارا، مگر اُس کے جسم پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ یہ دیکھ کر اُس کے مریدین کہنے لگے:

''انبیا کے جسم پر ہتھیار اَثر نہیں کرتے ہیں۔''

خلیفہ نے ان کی بات کی پروا نہ کی اور محافظ سے کہنے لگا:

''معلوم ہوتا ہے کہ تم نے بسم اللہ پڑھ کر نیزہ نہیں مارا؟''

''نہیں۔''

محافظ نے نفی میں سر ہلایا۔

''بسم اللہ پڑھ کر نیزہ مارو۔''

اب کی بار محافظ نے بسم اللہ پڑھ کر نیزہ مارا تو وہ حارث کذاب دمشقی کے جسم کے پار ہو گیا۔

حارث بُری طرح چیخ مار کر گرا اور مر گیا۔ یوں اس کے فتنے سے لوگوں کو نجات مل گئی۔

یہ 29 ہجری کا واقعہ ہے۔

(ماخذ: بائیس جھوٹے نبی، از نثار احمد خاں فتحی،
ائمہ تلبیس، از حضرت مولانا ابوالقاسم محمد رفیق دلاوری،
جھوٹے نبی از ابوالقاسم رفیق دلاوری)

درست فیصلہ

محمد اکمل معروف۔ حیدر آباد

پھٹ پھٹ کرتا ہوا رکشا سڑک پر رواں دواں تھا۔ طیب علی کی نظریں کسی سواری کی تلاش میں تھیں۔ موسم بہت زیادہ گرم اور حبس زدہ ہونے کی وجہ سے سڑکوں پر ٹریفک معمول سے کم دکھائی دے رہا تھا۔ زیادہ تر لوگ غیر ضروری طور پر گرمی میں باہر نکلنے سے گریز کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ہی طیب علی کو اندازہ ہو گیا کہ اب رکشے کو سڑکوں پر دوڑائے پھرنا فضول ہوگا، لہٰذا اُس نے گھر کا رُخ کیا۔ رکشا اپنے دروازے پر کھڑا کر کے گھر میں داخل ہوا تو اُس کی بارہ سالہ بیٹی بینا زور سے بولی: ''ابو آ گئے۔''

منہ ہاتھ دھونے کے بعد وہ پلنگ پر جا بیٹھا۔ اس کی بیوی شمسہ اس کے لیے کھانا نکال لائی اور بولی: ''کیا بات ہے، آج کچھ جلدی آ گئے؟''

''ہاں، آج بہت گرمی ہونے کے باعث سواریاں نہیں ہیں۔ رکشے کو بے کار دوڑاتے پھرنے سے بہتر تھا کہ گھر آ جاؤں۔'' اس نے جواب دیا۔

ابھی وہ کھانا کھا ہی رہا تھا کہ اس کا اکلوتا بیٹا وقار گھر میں داخل ہوا اور باپ پر نظر پڑتے ہی پاس آ بیٹھا۔

''ابو! بہت گرمی پڑ رہی ہے۔ اب تو پنکھے سے بھی گزارا نہیں ہوتا۔ میرے دوست یاسر کے ابو نے تو ایک کمرے میں پرانا اے۔ سی لگوا لیا ہے۔ ان کا کمرا اتنا ٹھنڈا رہتا ہے کہ جیسے سردی کا موسم ہو۔''

وقار نے حسرت سے باپ کو بتایا۔

''پرانا اے۔ سی بھی بہت مہنگا ملتا ہے، اور اگر کسی نہ کسی طرح خرید بھی لیں تو بجلی کا بل کون بھرے گا؟'' طیب علی نے منہ بنایا۔

''ابو! بجلی کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، جگاڑ ہو جاتا ہے، بس بجلی کے محکمے والوں کو دو ہزار روپے مہینا دو اور اے۔ سی چالو۔''

وہ پُراُمید نظروں سے باپ کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''وقار! اپنے ابو کو سکون سے کھانا کھانے دو، یہ رکشا چلاتے ہیں، جہاز نہیں، اور نہ ہی نوٹ آسمان سے برس رہے ہیں۔''

شمسہ نے اسے ڈانٹا۔ ماں کی ڈانٹ سن کر وہ خاموشی سے اٹھ کر سامنے بچھے پلنگ پر جا کر لیٹ گیا۔

……☆……

''یار طیب! میں اپنا پرانا اے۔ سی فروخت کر رہا ہوں، کوئی پارٹی ہو تو بتاؤ۔''

طیب رکشے کی ٹیوننگ کروانے گیا تو استاد دلبر نے اپنا کام کرتے ہوئے اس سے کہا۔

''استاد! تم کیوں فروخت کر رہے ہو؟ آج کل تو ویسے بھی بہت گرمی

پڑ رہی ہے۔'' طیب نے پوچھا۔

''یار! میری کمیٹی کھلی ہے۔ میرا اے۔سی ڈیڑھ ٹن کا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ دو ٹن کا نیا لے لوں۔'' وہ رکشے کو چیک کرتے ہوئے بولا۔

''استاد! سچی بات تو یہ ہے کہ نہ تو اے۔سی خریدنے کے پیسے ہیں اور نہ ہی بجلی کا بل برداشت کرنے کی ہمت ہے۔''

طیب نے دل کی بات کہہ دی۔

''او یار! میں کون سا بل بھرتا ہوں۔ بجلی والوں سے بات کی ہوئی ہے۔ پندرہ سو روپے ماہانہ پر کنڈا ڈال کر چلا رہا ہوں۔ دوپہر میں بھی کمرا اتنا ٹھنڈا ہوتا ہے کہ جیسے دسمبر کا مہینا ہو۔ اگر تجھے چاہیے تو اتنی رعایت کر سکتا ہوں کہ ہر مہینے دو ہزار روپے دیتے رہنا، دس ماہ میں اے۔سی کے پیسے پورے ہو جائیں گے۔''

استاد نے اسے بہترین پیش کش کی۔

ایک ہفتے بعد طیب علی کا کمرا بھی ٹھنڈا یخ ہو رہا تھا۔ استاد کا اے۔سی اور جگاڑ کی بجلی اپنا کام دکھا چکے تھے۔ وقار بہت خوش تھا۔ وہ ہر وقت اے۔سی والے کمرے میں لیٹا رہتا۔ طیب علی جب بھی گھر آتا اسے اے۔سی والے کمرے میں لیٹا دیکھتا۔ اسکول سے آنے کے بعد ہوم ورک اور دیگر کام وہ اسی کمرے میں انجام دیتا۔ اس کی بیٹی بینا البتہ اے۔سی والے کمرے میں بیٹھنے سے گریز کرتی تھی، وہ زیادہ تر برابر والے کمرے میں رہتی۔ شمسہ بھی بیٹی کی طرح اے۔سی کی عادت سے بچنا چاہتی تھی، اس لیے وہ بھی بینا کے ساتھ ہی دوسرے کمرے میں رہتی۔

.....☆.....

طیب علی نے رکشا دکان کے باہر روکا اور اُتر کر دکان میں داخل ہوا تو اسلم بھائی پر نظر پڑتے ہی مسکراتے ہوئے ان کے گلے لگ گیا۔ اسلم بھائی اس کے تایا زاد بھائی تھے اور عمر میں اس سے بڑے تھے۔ ان کی اسپیئر پارٹس کی دکان تھی اور ضرورت پڑنے پر طیب علی کبھی کبھی ان کی طرف چلا جاتا تھا۔

''طیب! آج تو تم بالکل درست وقت پر آ گئے ہو۔ میرے پاس دو آم کی پیٹیاں رکھی ہوئی ہیں۔ ایک اٹھا لو اور گھر لے جاؤ۔ بھابھی اور بچوں کے ساتھ بیٹھ کر کھا لینا۔'' وہ بولے۔

''اچھا! آم کہاں سے آ گئے آپ کے پاس؟''

اس نے اسلم بھائی سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ارے یار! بس آ گئے، تم لے جاؤ۔ تم آم کھاؤ، پیڑ نہ گنو۔''

انھوں نے خوش مزاجی سے جواب دیا۔

''میں وقار کو کہہ دیتا ہوں، وہ آ کر لے جائے گا۔''

طیب علی نے موبائل نکالا اور بیٹے کو فون کیا۔

''وقار! اسلم تایا کی دکان پر آ کر آم کی پیٹی لے جاؤ۔ مجھے ابھی رکشا چلانا ہے، شام ہو جائے گی مجھے گھر آتے آتے۔''

''ٹھیک ہے ابو! ابھی کچھ دیر میں لے جاؤں گا۔''

اس نے جواب دیا تو طیب علی نے فون بند کیا۔

طیب علی گھر پہنچا تو وقار اے۔سی والے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی طیب علی کو آم کی پیٹی یاد آ گئی۔

''وقار! تم اسلم بھائی کی دکان سے آم کی پیٹی لے آئے ہو؟''

طیب علی نے پوچھا تو وقار گڑبڑا گیا۔

''ابو! آج گرمی بہت تھی، اس لیے میں دوپہر کو نہیں جا سکا اور شام ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں ابھی کچھ دیر بعد چلا جاؤں گا۔''

بیٹے کا جواب سن کر طیب علی کی برداشت جواب دے گئی۔ وہ اٹھا اور اُس نے اے۔سی کا پلگ نکال دیا۔ اسی وقت موبائل نکالا اور کسی کے نمبر ملائے:

''ہیلو! عثمان میرے گھر آ کر اے۔سی نکال کر لے جاؤ۔ نہیں نہیں، اے۔سی بالکل ٹھیک ہے، بس میں اب اسے استعمال کرنا نہیں چاہتا، جس بھی قیمت پر فروخت ہو، کر دینا۔'' یہ کہہ کر اُس نے فون بند کر دیا اور پھر حیرت سے اس کا منہ دیکھتی شمسہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا:

''میں بہت دنوں سے محسوس کر رہا ہوں کہ اے۔سی لگنے کے بعد وقار ہر وقت اسی کمرے میں پڑا رہتا ہے اور کسی کام میں دل چسپی نہیں لیتا۔ ماں باپ اپنی اولاد کو ہر سہولت دینا چاہتے ہیں، مگر اُس کے نتیجے میں اولاد اگر بگاڑ کی طرف چلی جائے تو ایسی سہولت دینا بھی غلط ہے۔

آج میں نے اسے اسلم بھائی کی دکان سے آم کی پیٹیاں لانے کا کہا اور اس نے ہامی بھری، مگر نہیں لایا، کیوں کہ کمرے سے نکلتے ہوئے گرمی کا احساس ہو رہا تھا۔ کل ایسا نہ ہو کہ یہ مجھے بالکل ہی انکار کر دے کہ میں یہ کام نہیں کروں گا۔''

''آپ کی بات درست ہے، اور پھر کنڈے کی بجلی سے اے۔سی چلانا تو ویسے بھی جرم اور گناہ کی بات ہے، اس غلط کام کا تو یہی نتیجہ نکلنا تھا۔''

شمسہ نے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بالکل! تمھاری بات ٹھیک ہے۔ اللہ پاک مجھے معاف فرمائے۔''

طیب علی نے کہا تو شرمندگی سے وقار کا سر بھی جھکا گیا۔

لونگ

سعد علی چھیپا۔ کراچی

لونگ ایک خشک کلی ہوتی ہے، جسے ایک خوب صورت درمیانے قد کے سدا بہار درخت سے حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ درخت قد میں سیدھے تنے کے ساتھ دس سے بارہ میٹر بلند ہوتا ہے۔ اس کے پتے لمبے، نوکیلے اور خوش بودار ہوتے ہیں۔ درخت پر نو برس کی عمر میں پھول آتے ہیں۔ لونگ کا پھول آدھے انچ کے قریب لمبا اور خوش بودار ہوتا ہے۔

لونگ چین اور برصغیر میں دو ہزار سال سے زیرِ استعمال ہے۔ یہ گرم مسالوں میں شامل کیے جانے سے لے کر دانتوں کے امراض تک میں استعمال کی جاتی ہے۔ سانس کی بُو دُور کرنے کے لیے بھی لوگ اسے چباتے ہیں۔

کیمیائی تجزیے کے مطابق لونگ میں کاربوہائیڈریٹس، رطوبت، پروٹین، ایتھر کا جوہر (چکنائی)، خام ریشہ اور معدنی مادے ہوتے ہیں۔ ہائیڈروکلورک ریبوفلاوین، نایا سین، وٹامین سی۔ اور اے۔ بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کی غذائی صلاحیت ایک سو گرام میں 430 کیلوریز ہیں۔

لونگ کے فوائد:

☆ لونگ میں ایسے اجزا پائے جاتے ہیں جو خون کی گردش کو مستحکم کرتے ہیں اور جسم کا درجہ حرارت برقرار رکھتے ہیں۔

☆ لونگ کے استعمال سے گلے کی خراش کم ہو جاتی ہے اور کھانسی رک جاتی ہے۔ حلق کی سوزش بھی اس سے ختم ہو جاتی ہے۔

☆ لونگ کا استعمال ہیضہ کے تدراک میں بہت کام یاب ہے۔

☆ لونگ اعصاب کو بھی طاقت دیتی ہے۔

☆ لونگ، مقوی معدہ، محرک جگر و گردہ ہوتی ہے۔

☆ بخار کے بعد لونگ مریض کو کھلانے سے مرض کی کمزوری جلد ختم ہو جاتی ہے۔

☆ لونگ نظام ہضم کو بہتر کرتی ہے۔ اسے معدے کی متعدد تکالیف اور بدہضمی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

☆ تشنج اور اینٹھن کو کم کرتی ہے۔ معدے سے ریاح کو خارج کرنے میں مدد دیتی ہے۔

☆ دانت درد میں لونگ کا استعمال درد کا فور کر دیتا ہے۔ اس کے جراثیم کش اجزا دانتوں کے انفیکشن کو بھی ختم کر دیتے ہیں۔ متاثرہ دانت کے خلا میں لونگ کا تیل لگانے سے درد ختم ہو جاتا ہے۔

☆ لونگ، منہ کو صحت مند رکھتی ہے۔ منہ کی اندرونی صحت کے لیے لونگ کو کارآمد سمجھا جاتا ہے۔ یہ منہ کے جراثیم، سوزش اور جلن کو ختم کرتی ہے۔

☆ لونگ کا تیل بھی بے حد مفید اور کارآمد ہے۔ اس کے اندر بڑی مقدار میں فنیول پائی جاتی ہے، جو اعلیٰ درجے کی اینٹی سیپٹک ہے۔

☆ لونگ کا تیل پیٹ درد، اپھارہ، بدہضمی اور قے وغیرہ کو دور کرتا ہے۔

☆ لونگ کا تیل جوڑوں کے درد کے لیے بے حد مفید ہے۔

☆ لونگ کا تیل جلد کے لیے مفید اور بہترین غذا ہے۔ اس کی مالش سے جلد صاف اور سرخی مائل ہو جاتی ہے۔

☆ کان میں درد کی شکایت میں لونگ کا تیل کان میں ڈالنے سے آرام آجاتا ہے۔

تمام قارئین کرام سے مؤدبانہ عرض ہے کہ کسی بھی سبزی کے فوائد پڑھ کر اسے زیادہ نہ کھائیں، بل کہ اس کا استعمال اعتدال سے کریں اور اگر آپ کو کوئی خاص بیماری ہے تو اپنے ڈاکٹر سے مشورہ کر کے کوئی بھی غذا استعمال کریں۔

''سفیان! چلو باہر کھیلنے چلتے ہیں۔''

سفیان، احمد کی آواز پر اُٹھ کر جانے لگا تو اکرم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے واپس بٹھا دیا۔

''نہیں احمد! ہم ابھی ہوم ورک کر رہے ہیں۔ تم جاؤ، ہم بعد میں آئیں گے۔''

اکرم کی بات پر اَحمد بُرا سا منہ بناتا واپس چلا گیا۔

''تم نے مجھے جانے کیوں نہیں دیا احمد کے ساتھ؟''

اکرم نے کہا اور سفیان اثبات میں سَر ہلا کر ہوم ورک کرنے لگا۔

اکرم اور سفیان، دو ہی بھائی تھے۔ اپنے امی ابو کے ساتھ وہ ایک بڑے سے گھر میں خوش حال زندگی گزار رہے تھے۔ اکرم سفیان سے دو سال بڑا تھا اور ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا، جب کہ سفیان پانچویں جماعت کا طالب علم تھا۔ دونوں بھائی ذہین اور نہایت تمیز دار تھے۔ چند ماہ قبل ان کے پڑوس میں احمد اپنے گھر والوں کے ساتھ آیا تھا۔ احمد کے والد اُن کے پڑوسیوں کے گھر

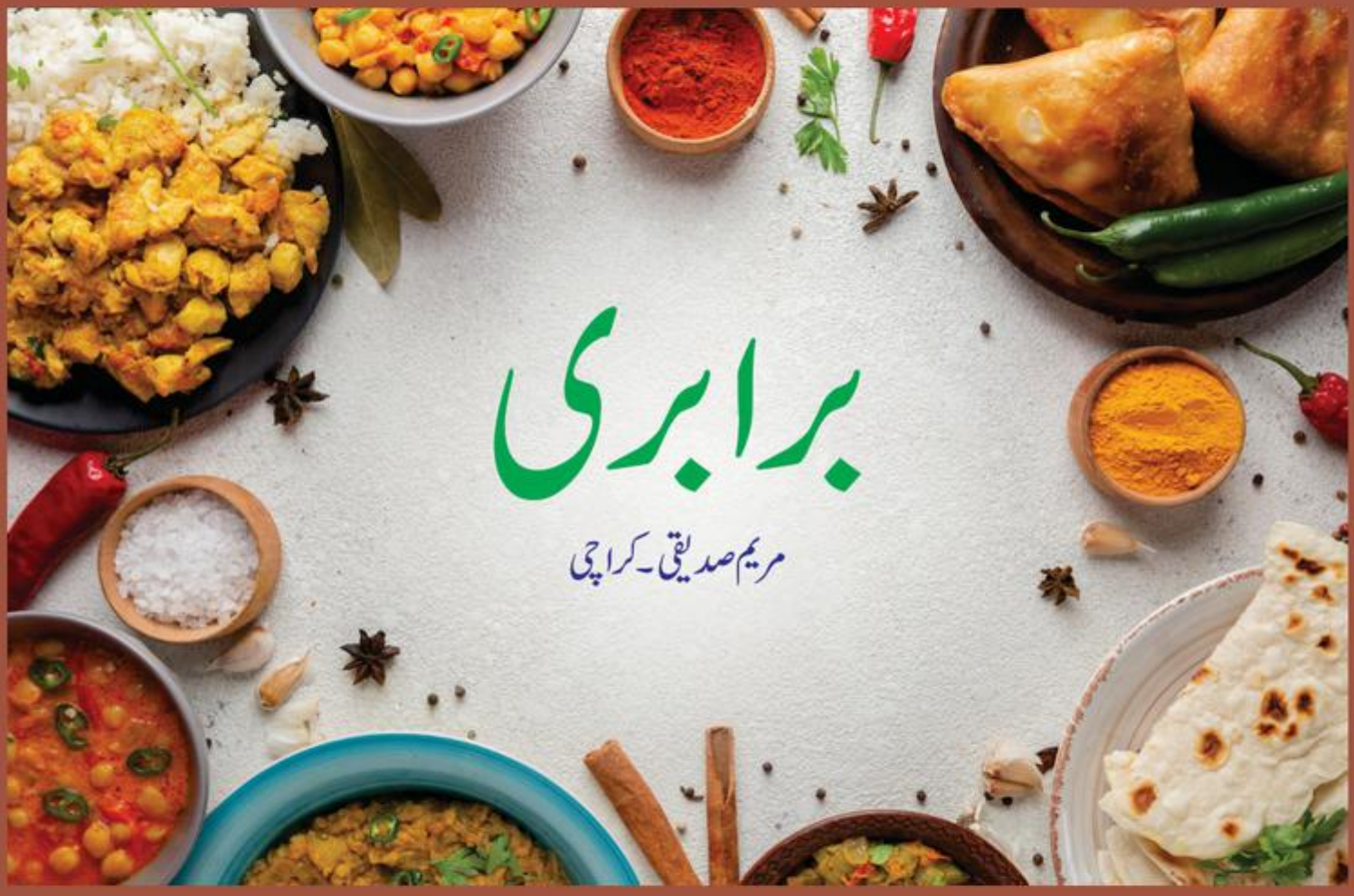

برابری

مریم صدیقی۔ کراچی

''کیوں کہ وہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ ہر وقت میلا کچیلا رہتا ہے۔ لگتا ہے اس کی امی اس کے کپڑے بھی نہیں دھوتیں، اور کیا تمھیں یاد نہیں، کچھ دن پہلے وہ ہارون انکل کی دکان سے پیسے چراتے ہوئے بھی پکڑا گیا تھا۔''

اکرم کے تفصیلی جواب پر سفیان نے اثبات میں سَر ہلایا، لیکن نہ جانے کیوں اسے ہمیشہ ہی احمد سے ہمدردی محسوس ہوتی تھی اور اُسے یقین تھا کہ اس دن بھی احمد نے چوری نہیں کی تھی۔ یقیناً کوئی اور بات ہوگی۔

''اب تم کیا سوچ رہے ہو، چلو جلدی ہوم ورک ختم کرو۔''

میں چوکی دار تھے، اس لیے وہ احمد اور اُس کی امی کے ساتھ وہیں منتقل ہو گئے تھے۔ ایک آدھ دفعہ آتے جاتے سفیان کی احمد سے دوستی ہوگئی اور پھر اکرم سے بھی ہوگئی۔ وہ تینوں ہمیشہ ساتھ کھیلا کرتے تھے، لیکن سفیان نے نوٹ کیا تھا کہ اکرم اب احمد سے کھنچا کھنچا سا رہتا ہے، جب کہ سفیان، احمد کو ہمیشہ بھائیوں جیسا سمجھتا تھا اور اُن دونوں کے والدین کو بھی اس بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

سفیان شام کو کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا جب اسے دروازے کے باہر رکھی کرسی پر اَحمد گم صم سا بیٹھا دکھائی دیا۔ سفیان اسے دیکھ کر فوراً دوڑ کر

باہر آیا اور اکرم سے نظریں بچا کر دروازے کی طرف لپکا۔ اکرم اپنی ڈرائنگ بک پر ڈرائنگ بنانے میں مصروف تھا، اس لیے اس نے سفیان کو کمرے سے آتے اور باہر جاتے نہیں دیکھا۔

''احمد! تم یہاں ایسے کیوں بیٹھے ہو؟''

احمد نے سفیان کے سوال پر نظریں اٹھا کر اُسے دیکھا اور منہ پھیر لیا۔

''کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟''

سفیان نے اس کے سامنے زمین پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔''

احمد کے جواب سے سفیان مطمئن نہیں ہوا۔

''بتاؤ مجھے، تم اداس کیوں ہو؟ تم تو بھائی ہو نا میرے!''

سفیان نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ احمد کی آنکھوں سے آنسو نکل کر سفیان کے ہاتھ پر گر پڑے۔

''تمھیں اور اکرم کو یہی لگتا ہے ناں کہ ہارون انکل کی دکان سے پیسے میں نے چرائے تھے۔ تم دونوں اسی لیے اب میرے ساتھ نہیں کھیلتے۔''

احمد کی بات پر سفیان نے نفی میں سر ہلایا۔

''بالکل بدھو ہو تم، ہم دونوں کے امتحانات ہونے والے ہیں اور امی چاہتی ہیں کہ ہم دونوں صرف امتحان کی تیاری کریں۔ میں جانتا ہوں، میرا بھائی چوری کر ہی نہیں سکتا۔''

سفیان نے سمجھ داری سے اسے سمجھایا اور اُس کے آنسو صاف کیے۔

''چلو آؤ، کچھ کھیلتے ہیں۔''

سفیان کی پیش کش پر احمد نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''سفیان! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

ابھی وہ گیند لے کر ہی آیا تھا کہ اکرم وہاں پہنچ گیا۔

''وہ..... میں احمد کے ساتھ کھیل رہا ہوں۔'' سفیان منمنایا۔

''گھر چلو، امی بلا رہی ہیں۔''

اکرم نے سفیان کا ہاتھ پکڑ کر اُسے گھسیٹا۔ احمد نے اداس چہرے کے ساتھ اکرم اور پھر سفیان کو دیکھا۔ سفیان جانتا تھا کہ اب اکرم اسے یہاں رکنے نہیں دے گا۔

''احمد! میں تمھارے ساتھ شام کو کھیلوں گا، تم پریشان مت ہونا۔''

احمد کو کہہ کر سفیان، اکرم کے ساتھ چلا آیا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اکرم کے رویے کے بارے میں امی کو ضرور بتائے گا۔

اس نے کمرے میں آ کر امی کو دیکھا، تاکہ پوچھ سکے کہ انھوں نے اسے کسی کام سے تو نہیں بلایا، لیکن امی کو کمرے میں نماز اَدا کرتے دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ اکرم اس سے جھوٹ بول کر اُسے اندر لایا ہے۔

رات کو کھانے کے بعد وہ دونوں اپنے کمرے میں آ گئے۔ اکرم تو تھوڑی دیر بعد ہی سو گیا، لیکن سفیان لیٹے لیٹے چھت کو گھورتا رہا، اکرم کا بدلا بدلا سا رویہ وہ کافی دن سے دیکھ رہا تھا۔ ان کے کمرے کی بتی کھلی دیکھ کر امی کمرے میں آئیں اور سفیان کو جاگتا پا کر اُس کے سرہانے بیٹھ گئیں۔

''آپ سوئے نہیں ابھی تک؟''

انھوں نے اس کا سر سہلاتے ہوئے پوچھا۔

''امی مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے۔''

سفیان اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''جی بتائیے۔''

سفیان نے اول تا آخر ساری بات امی کو بتائی کہ کیسے چند دن سے اکرم کا رویہ احمد کے ساتھ بے حد خراب ہے اور وہ اسے بھی احمد کے ساتھ کھیلنے، یہاں تک کہ بات بھی نہیں کرنے دیتا۔ امی نے احمد کی مکمل بات سن کر اُسے اطمینان دلایا کہ وہ اکرم سے خود بات کریں گی اور اُسے سمجھائیں گی بھی کہ کسی کے ساتھ بھی ایسا رویہ رکھنے سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو جاتا ہے۔ امی کی بات سن کر سفیان مسکرا دیا۔

اگلے دن جب وہ دونوں اسکول سے گھر آئے تو امی باورچی خانے میں کام کرتی ہوئی نظر آئیں۔ اتنے سارے مختلف قسم کے کھانے دیکھ کر دونوں بھائیوں کے منہ میں پانی آ گیا۔

''امی آج کوئی مہمان آ رہا ہے؟ کیا ہمارے گھر میں کسی کی دعوت ہے؟''

''ہاں بھئی، ہمارے گھر میں بہت خاص مہمان آ رہے ہیں، جن کے لیے میں نے یہ سب مزے مزے کے پکوان بنائے ہیں۔ اب تم دونوں جاؤ، جلدی سے کپڑے تبدیل کر کے آؤ، پھر ہم سب مل کر کھانا کھائیں گے۔''

''امی! کون آ رہا ہے؟ کیا ماموں جان آ رہے ہیں؟''

سفیان نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ارے نہیں، احمد اور اُس کی امی کو آج میں نے دوپہر کے کھانے پر بلایا ہے۔''

احمد کا نام سن کر اکرم کے چہرے کے زاویے بگڑ گئے، جسے سفیان اور امی، دونوں نے ہی نوٹ کیا۔

''امی! آپ نے انھیں کیوں اپنے گھر بلایا؟ مجھے وہ لوگ بالکل پسند

نہیں ہیں۔"

اکرم کے لہجے پر وہ دنگ رہ گئیں۔

"یہ آپ کس لہجے میں بات کر رہے ہیں اکرم!؟ اور کیوں پسند نہیں ہیں وہ آپ کو؟"

"کیوں کہ وہ ہمارے پڑوسیوں کے یہاں کام کرتے ہیں، وہ ہماری برابری نہیں کر سکتے، نہ ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا سکتے ہیں۔"

"یہ آپ سے کس نے کہا بیٹا! کہ وہ ہماری برابری نہیں کر سکتے؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ سب انسان برابر ہوتے ہیں۔ جیسے آپ کے بابا آفس میں کام کرتے ہیں ویسے ہی احمد کے بابا بھی صفدر انکل کے گھر میں کام کرتے ہیں۔ اس سے کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہوتا۔"

"لیکن امی! وہ احمد اتنا گندا رہتا ہے، اور مجھے زبیر نے بتایا تھا کہ جو نوکر ہوتے ہیں وہ ہمارے برابر نہیں ہوتے۔ اس کی امی تو اُسے ان کے ساتھ کھیلنے بھی نہیں دیتیں۔"

"اکرم! آپ کو زبیر کی باتیں یاد ہیں، میری باتیں یاد نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو ایک جیسا اور سب کو برابر بنایا ہے، کوئی بھی بڑا چھوٹا نہیں ہے۔ جہاں تک بات ہے احمد کے کپڑوں کی تو ہم احمد کو نئے کپڑے، جوتے اور کتابیں تحفے میں دے دیں گے۔ بیٹا! کسی سے دور نہیں بھاگتے، بل کہ اس کی مدد کر کے اسے اپنے ساتھ کھڑا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو غرور ہرگز پسند نہیں ہے۔ جو لوگ غرور کرتے ہیں اور اکڑتے ہیں، اللہ پاک ان سے ناراض ہو کر ساری نعمتیں واپس لے لیتا ہے۔ وہ چاہے تو آپ سے بھی ساری نعمتیں واپس لے کر احمد کو دے سکتا ہے۔"

اکرم نے یہ سن کر پریشانی سے امی کو دیکھا۔ وہ تو زبیر کی باتوں میں آ گیا تھا، اب اگر اللہ پاک اس سے ناراض ہو گئے تو!

"بیٹا! اللہ پاک نے جو کچھ دیا ہے اس کا شکر ادا کرنے کا طریقہ یہ بھی ہے کہ اس کے بندوں کی مدد کی جائے، وہ اس سے خوش ہوتا ہے، اور مجھے یقین ہے کہ آپ نہیں چاہیں گے کہ اللہ تعالیٰ آپ سے ناراض ہو جائے۔"

"آئی ایم سوری امی!" اکرم کا چہرہ دیکھ کر امی مسکرا دیں۔

"اب آپ دونوں شام کو بابا کے ساتھ جا کر احمد کے لیے سارا سامان لے کر آئیں گے، پھر ہم احمد کا آپ کے اسکول میں داخلہ بھی کروا دیں گے۔"

امی کی بات پر وہ دونوں مسکرا دیے۔

بقیہ: بلا عنوان

جاتے ہیں جو بچوں کی ذہنی استعداد کو بڑھانے اور اُن کی ذہنی نشوونما کرنے میں بہت مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ جیسے بچوں کو مختلف طرح کی تخلیقی سرگرمیوں میں شامل کرنا۔ بچوں کو مختلف ذہنی اور جسمانی ٹاسک دینا، جن میں کام یابی پر اُنھیں چھوٹے چھوٹے انعام وغیرہ دینا۔" پرنسپل صاحب نے تفصیل سے سمجھایا۔ نجم علی نے سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"میں پوری کوشش کروں گا۔" نجم علی نے عہد کیا۔

اگلے دن نجم علی نے محلے کے سب بچوں کو جمع کیا اور اُن کے درمیان دوڑ کا مقابلہ کروایا۔ جیتنے والے بچوں کو انعام میں جیومیٹری باکس ملا۔ بچے انعام پا کر بہت خوش ہوئے۔ کچھ دن بعد نجم علی نے پھر بچوں کو جمع کیا اور اُن کے درمیان بیت بازی کا مقابلہ کروایا، پھر سب بچوں میں مٹھائی تقسیم کی۔ بچے بہت حیران ہوئے۔ نجم علی اسکول میں بھی بہت تحمل اور سمجھ داری کے ساتھ بچوں کو پڑھا کرنے لگے۔ وہ صرف ان بچوں کو ڈانٹتے یا سزا دیتے جو غلط کام یا شرارت کرتے۔ اچھے بچوں کی حوصلہ افزائی کرتے، انھیں سراہتے اور انعام دیتے۔ آہستہ آہستہ نجم علی بچوں کے پسندیدہ اساتذہ میں شامل ہونے لگے۔ نجم علی نے بچوں کو پڑھاتے اور سمجھاتے ہوئے خود بھی سیکھا تھا کہ اچھے اخلاق اور رویے کا اثر کتنا پائے دار ہوتا ہے۔

بچے اب ان پر اعتبار کرتے تھے۔ ان کی بات سنتے تھے۔ نجم علی اکثر خالی دورانیے میں بچوں کو حدیث شریف اور قرآن پاک میں سے چھوٹے چھوٹے واقعات سناتے، جنھیں سن کر بچے بہت متاثر ہوتے۔ نجم علی بچوں کو سائنسی ترقی اور نت نئے تجربات کے بارے میں۔

نجم علی کے اچھے اخلاق اور رویے کا پہلا اثر اس جگہ ہوا جہاں وہ رہتے تھے۔ پہلے محلے میں نجم علی کے آنے کی وجہ سے ہر وقت لڑائی جھگڑا رہتا تھا۔ اب کچھ عرصے میں ہی محلے کا ماحول پہلے سے بہت بہتر اور اچھا ہو گیا تھا۔ محلے کے بزرگ بھی نجم علی کے بدلے ہوئے رویے سے بہت خوش تھے۔

نجم علی دن میں کئی بار اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے کہ جس نے انھیں نیکی اور ہدایت کا وہ راستہ دکھایا جو پھولوں کی سے سجا ہوا تھا۔ جس پر محبت، نرمی، شفقت، احسان، خوش دلی اور مسکراہٹ کے کئی خوش نما پھول کھلے ہوئے تھے۔

اس راستے پر چلتے ہوئے وہ معصوم اور پیارے بچوں کو بہترین راہ پر چلنا سکھا رہے تھے۔ یہ پھولوں کی راہیں انھیں انسانیت کے اعلیٰ مقام سے اپنے رب کی رضا تک لے جانے والی تھیں۔ یہی ایک بہترین استاد بن کر نجم علی کا عزم تھا اور یہی ان بچوں کا نصب العین بن چکا تھا۔

آرزوئے ناتمام

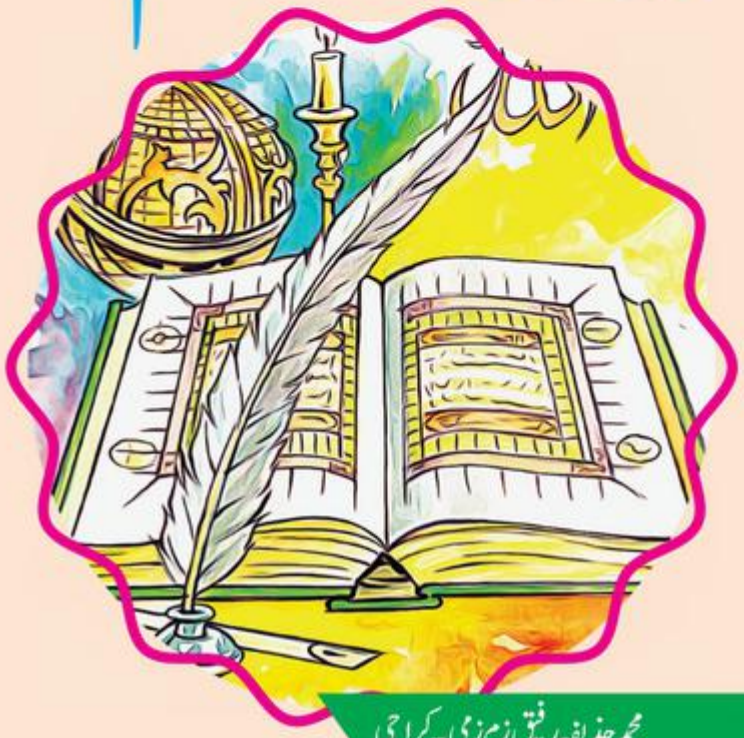

محمد حذیفہ رفیق زم زمی۔ کراچی

ابوجعفر منصور سن ۹۵ ھ میں پیدا ہوئے۔ بچپن کا زمانہ اور جوانی کی ابتدائی بہاریں علم دین کے حاصل کرنے میں صرف کیں۔

یہ دوسری صدی کا ابتدائی زمانہ تھا اور اُس وقت عالم اسلام میں یہی اعلیٰ تعلیم تھی۔ ثقافت اور تہذیب کا معیار بھی یہی تھا کہ جو حدیث رسول ﷺ میں زیادہ مہارت رکھتا تھا وہ اتنا ہی زیادہ معاشرے میں صاحب وقعت اور ذی وقار تھا اور اِس عظیم تعلیم سے محروم رہنے والا ناخواندہ شمار کیا جاتا تھا۔

اگرچہ مدارس کی کوئی منظم شکل نہیں تھی، لیکن ہر مسجد ایک مدرسہ تھا اور جہاں کوئی محدث پایا جاتا وہ مسجد میں حدیث کا درس دیتا۔ مختلف علاقوں سے اور بسا اوقات دور دراز کا سفر کر کے طلبہ ان کے پاس حاضر ہوتے، ان سے احادیث سنتے اور پھر کسی دوسرے محدث کے پاس چلے جاتے۔

ہر ایک کی کوشش ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ محدثین سے اللہ کے رسول ﷺ کی احادیث حاصل کروں، یعنی صرف حدیث سننا ہی مقصد نہیں ہوتا تھا، بل کہ ہر ایک کی چاہت ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ واسطوں سے احادیث حاصل کرے، انھی واسطوں کو علمی زبان میں سند (lineage) کہتے ہیں، یہاں تک کہ اگر کسی طالب علم کو پتا چل جاتا کہ کسی دور دراز گاؤں میں کوئی محدث رہتا ہے تو اُن کے پاس بھی سفر کر کے پہنچتا، تا کہ اس کے واسطے سے بھی وہ احادیث سن لے۔

اسی پاکیزہ معاشرے کا اثر تھا کہ ابوجعفر بھی لڑکپن میں حدیث پڑھنے لکھنے میں مصروف رہا۔ وہی دھن اس پر سوار بھی تھی جو ہر حدیث کے طالب علم پر سوار ہوتی تھی کہ کسی طرح زیادہ سے زیادہ احادیث لکھ لوں، کسی طرح زیادہ سے زیادہ محدثین سے میری ملاقات ہو جائے!

اور بھلا کیوں نہ ہوتا یہ جذبہ اور ولولہ! کہ اس کے خون میں علم کا شوق اور اُس کی طلب شامل تھی۔ یہ امت کے سب سے بڑے مفسر، رسول اللہ ﷺ کے چچازاد بھائی اور تربیت یافتہ صحابی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا پوتا تھا۔

اس کا پورا نام ہے:

''عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم!''

نوجوانی کی بہاروں میں جب وہ گرم خون کے جوش میں حدیث نبوی حاصل کیا کرتا تھا اور محدثین کے حلقے میں بیٹھا کرتا تھا، طلبہ کا ایک جم غفیر ہوتا تھا، ہر ایک کے ہاتھ میں قلم، دوات اور کاغذ ہوتا تھا۔

محدث، مسند پر بیٹھ کر رسول اللہ ﷺ کی احادیث محبت اور عشق سے بھرے ہوئے لہجے میں سناتے جاتے تھے اور طلبہ اپنے استاد کے لبوں سے نکلا ہوا ہر ہر جملہ تحریر کرتے چلے جاتے تھے۔ جہاں نبی کریم ﷺ کا اسم گرامی آتا وہاں ہر لب پر درود شریف جاری ہوتا، جس سے مسجد میں ہلکی سی گونج پیدا ہو جاتی۔

کئی دفعہ مجمع ہزاروں تک پہنچ جاتا۔ ہر سو، دو سو کے بعد ایک طالب علم کھڑا ہو جاتا اور اُستاد کے الفاظ کو آگے نقل کرتا رہتا، جس طرح جماعت کی نماز میں مجمع زیادہ ہو جائے تو ایک شخص امام صاحب کی تکبیر کو دُہراتا ہے، تا کہ پیچھے والوں تک آواز پہنچ جائے۔

عمر کی نجانے کتنی بہاریں ابوجعفر نے انھی حلقوں میں گزاری تھیں اور نجانے کتنی صبحیں انھی پُرنور مجالس میں بیٹھا تھا۔ نجانے کتنی دفعہ وہ بھی مکبر بنا ہوگا، کتنے ہی محدثین سے اس نے احادیث سنی ہوں گی!

وہ بھی ایک زمانہ ہوگا جب وہ محدثین کے حلقوں میں ادب سے حاضر ہوتا ہوگا، ان سے حدیث کا علم حاصل کرتا ہوگا اور رشک کی نگاہ سے ان محدثین کو دیکھتا ہوگا، جنھوں نے اپنی زندگی اس قیمتی اور بیش بہا علم کے لیے وقف کر دی ہے اور اللہ تعالیٰ نے انھیں کیسی عزت اور بلند مرتبہ عطا فرمایا ہے!

وہ سوچتا ہوگا کہ ان کا نام قیامت تک عزت اور اِحترام سے لیا جائے گا، کیوں کہ ان کے نام اس کڑی سے جُڑ گئے ہیں جس کی انتہا رسول اللہ ﷺ کے نام پر ہوتی ہے۔

جس طرح رسول اللہ ﷺ کا نام اور آپ ﷺ کے اقوال اور اَفعال قیامت تک زندہ اور معزز رہیں گے، اسی طرح اس معطر سلسلہ سند میں ان نیک لوگوں کا ذکرِ خیر بھی سدا زندہ رہے گا۔

اس کا دل یہ کہتا ہوگا کہ یہ کتنے خوش نصیب لوگ ہیں جن کی زندگی وصول ہوگئی، جنھوں نے اپنی دنیا کی زندگی کو سب سے بہترین مصرف میں خرچ کر اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جو چند سالوں کے امتحان کے لیے بھیجا ہے، اس کی حقیقت کو سمجھ لیا اور اُس کا بہترین مصرف تلاش کر لیا، پھر اپنے آپ کو اُس کے لیے وقف کر دیا۔ زہے قسمت! کیا خوش نصیبی ہے ان پاکیزہ ہستیوں کی!

جب یہ سوچ اس کے دل و دماغ میں گردش کرتی ہوگی تو وہ بھی یہ تمنا کرتا ہوگا کہ کاش میں بھی ایک روز اِن ہستیوں کی طرح بن جاؤں اور اُسی مسند پر بیٹھوں اور اپنی زندگی کی قیمت وصول کروں؟

اس وقت ابوجعفر کے تصور میں بھی نہ ہوگا کہ ایک زمانہ وہ بھی آئے گا جب وہ امیر المؤمنین ابوجعفر منصور کہلائے گا اور ۳۲ لاکھ مربع میل کی حکومت کی باگ ڈور اُس کے ہاتھ میں ہوگی۔

بنواُمیہ کے خاندان میں خلافت تھی۔ ابوجعفر کے خاندان میں نہ کوئی خلیفہ تھا نہ کسی کے خلیفہ بننے کی توقع تھی۔ اس کے والد خلیفہ تو کیا، ادنیٰ گورنر بھی نہیں تھے اور اُس کے دادا تو زمانے کے علامہ اور مفسر تھے، بل کہ ان کا علمی مقام تو ساری دنیا پر عیاں ہے۔

لیکن یہ بھی زمانے میں کوئی تعجب خیز نہیں کہ نفس اور خواہش کی تیز و تند ہواؤں نے آخرت کے بہت سے مسافروں کی آنکھوں کو خیرہ اور منزل مقصود کو دُھندلا کر دیا ہے، یہاں تک کہ وہ اسی میں الجھ گئے اور موت کا فرشتہ آ پہنچا!

یہ قصہ ہے زندگی کا!

.....☆.....

سن 132ھ میں تاریخ کا انقلاب برپا ہوا، بنواُمیہ کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور بنوعباس نے تخت و تاج سنبھالا۔

(یہاں یہ ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا کہ انھوں نے اپنی ایک عارضی خلافت قائم کرنے کی خاطر سینکڑوں نہیں، ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کا خون پانی طرح بہایا اور ظلم و ستم کی ناقابل فراموش داستان رقم کی۔ ظلم در ظلم یہ کہ مرنے والے بھی مسلمان اور مارنے والے بھی مسلمان، صرف خاندان پرستی کا یہ کرشمہ تھا کہ مسلمانوں کو باہم دست و گریبان کیا۔ اللہ تعالیٰ سب کا حساب لینے والا ہے۔)

خلافت عباسیہ کا سب سے پہلا خلیفہ، بانی اور مؤسس ابوجعفر منصور کا چھوٹا بھائی ابوالعباس سفاح ہے۔ اس نے تقریباً ساڑھے تین سال حکومت کی، جس کے بعد اُس کا بڑا بھائی ابوجعفر منصور، ۴۱ سال کی عمر میں خلیفہ بنا۔ دونوں بھائیوں کا نام عبداللہ بن محمد ہے۔

ابوجعفر منصور نے تقریباً ۲۲ سال حکومت کی، سن ۱۳۶ھ سے ۱۵۸ھ تک (۷۵۴ء-۷۷۵ء) وہ خلیفہ رہا۔

.....☆.....

ابوجعفر کے زمانہ خلافت میں، جب کہ اس کی خلافت کو بھی ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا، اس سے پوچھا گیا:

يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ هَلْ بَقِيَ شَيْءٌ مِنَ اللَّذَّاتِ لَمْ تَنَلْهُ؟

(امیر المؤمنین! کیا دنیا کی کوئی لذت اب بھی ایسی ہے جس سے آپ محروم ہیں؟)

کہنے لگے:

''ہاں، ایک تمنا اور آرزو ہے جو مجھے نہیں مل سکی!''

حاضرین نے پوچھا:

''ایسی کون سی خواہش ہے آپ کی جو پوری نہیں ہو سکی؟''

ابوجعفر نے حسرت بھرے لہجے میں ایک منظر کھینچا:

''میری یہ تمنا تھی کہ میں مسند حدیث پر بیٹھ کر رسول اللہ ﷺ کی احادیث بیان کرتا اور میرے سامنے حدیث رسول کے سچے عاشقوں کا مجمع ہوتا۔ وہ میری بیان کردہ احادیث کو نقل کر رہے ہوتے، لکھتے لکھتے اچانک

ایک طالب علم کھڑے ہو کر کہتا:

استادِ محترم! آپ سند دوبارہ بتا دیجیے، آپ پر اللہ کی رحمت ہو!''

میری یہ تمنا تھی کہ میری آنکھیں یہ منظر دیکھتیں، میں ایسے نورانی ماحول میں صبح وشام کرتا اور ایسے پاکیزہ صفت لوگوں میں میری زندگی کی ساعتیں گزرتیں!

چوں کہ ابوجعفر منصور کی نوعمری انھیں نورانی مجالس میں گزری تھی، چناں چہ عمر بھر اُس کا اثر باقی رہا تھا، اس لیے ادھیڑ عمر میں پہنچ کر بھی وہ اس نورانیت اور روحانیت کو بھلا نہیں سکا تھا۔

حاضرین کے اس سوال پر وہ ساری گزشتہ یادیں تازہ ہوگئیں اور وہ تڑپ جاگ اٹھی کہ کاش میں موت تک انھی حلقوں کا حصہ بنا رہوں، لیکن یہ سعادت فقط صلاحیتوں اور کمالوں کی بنیاد پر نہیں ملا کرتی، بل کہ اس کے لیے تو سچی تڑپ مطلوب ہے ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

(یہ سعادت زورِ بازو سے نہیں ملا کرتی، جب تک کہ رب ذوالجلال کی طرف سے عطا کے فیصلے نہ ہوں!)

بس پھر کیا تھا! اگلے دن خلیفہ کے درباری اور وزرا کے بیٹے، سب کے سب ایک ہاتھ میں رجسٹر تھامے اور دوسرے میں قلم اور دوات سنبھالے دربار میں حاضر ہو گئے۔

خلیفہ دربار میں پہنچا تو یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ حاضرین کا گمان تھا کہ خلیفہ انھیں دیکھ کر خوش ہو جائے گا اور اپنی حسرت نایافت کی تکمیل کرے گا، اور خلیفہ اگر چاہتا تو بہت آسانی سے وہ ایسا کر سکتا تھا، کیوں کہ وہ خود کئی سال اس علمی میدان کا شہ سوار رہ چکا تھا، لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ لوگ جو روپ دھار کر سامنے آئے ہیں وہ ان پر زیب ہی نہیں دیتا۔

شاید کوئی ان مجالس کی حقائق سے ناآشنا شخص یہ منظر دیکھ کر خوش ہو جاتا اور اِسی کو حقیقت سمجھنے لگتا، لیکن ابوجعفر منصور چوں کہ ان مبارک محفلوں میں رہ چکا تھا، وہ اس پُرنور جھرمٹ کے تاروں کو اور اُن کی صفات کو پہچانتا تھا، اس لیے وہ اس ظاہری روپ سے دھوکے میں آنے والا نہیں تھا۔

اس نے ایک تاریخی جملہ کہا، جس میں علم دین سیکھنے اور پڑھنے والوں کی صفات کا ایک نقشہ کھینچا، جسے زمانے کی گردش کے باوجود تاریخ نے اپنے سینے میں محفوظ رکھا، اس نے کہا:

لستم بهم، إنما هو الدَّنِسَةُ ثيابُهم، المشقَّقَةُ أرجلُهم، الطويلةُ شعورُهم، رُوَّادُ الآفاق و قُطَّاع المسافات، تارة بالعراق و تارة بالحجاز، و تارة بالشام، و تارة باليمن. فهؤلاء نقلة الحديث۔

(ارے کہاں تم اور کہاں وہ علم دین کے شیدائی! (یہ منہ اور مسور کی دال!)

وہ علم کے دیوانے تو ایسے ہوتے ہیں کہ علم کے سفر میں پھر پھر کر اُن کے کپڑے غبار آلود ہو چکے ہوتے ہیں، ان کے پاؤں میں آبلے پڑ چکے ہوتے ہیں اور تلوے پھٹ چکے ہوتے ہیں۔

وہ علم کے حصول میں ایسے مگن ہوتے ہیں کہ ان کے بال بڑھ چکے ہوتے ہیں، (انھیں اتنی بھی فرصت میسر نہیں ہوتی ہے کہ اپنے بالوں کو سنوار لیں اور سدھار لیں۔

ان کی جوانی کی بہاریں، بازوؤں کی طاقت، خون کی گرمی اور پیروں کی قوت، سب کچھ اسی مبارک مشغلے کی خاطر) مشرق ومغرب کے سفر میں گزرتی ہیں اور دور دراز کی مسافتیں طے کرنے میں کٹتی ہیں۔

کبھی وہ عراق کی خانقاہوں کے مقیم ٹھہرے، کبھی حجاز کے صحراؤں میں خیمہ زن ہوئے، کبھی شام کی وادیوں کے مسافر بنے اور کبھی یمن کے میدانوں کے راہی ہوئے۔)

یہ ہیں رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے نقل کرنے والے، آپ ﷺ کے مبارک اقوال کے سچے حامل اور آپ ﷺ کی شریعت کو دنیا میں پھیلانے والے!

فجزاهم الله خير الجزاء

پانی تو اچھا ہے

دیا خان بلوچ۔ لاہور

شدید گرمی کے مہینے انسانوں کے ساتھ ساتھ جانوروں اور پرندوں کے لیے بھی بہت صبر آزما تے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اِس تپتی دوپہر میں جنگل کا چپہ چپہ سنسان تھا۔

جنگل کے بائیں طرف ایک چھوٹی سی بستی ہے، جس میں رنگ برنگی خوب صورت چڑیاں رہتی ہیں۔ اِن چڑیوں میں ایک ننھی سی سنہری چڑیا بھی شامل ہے، جو باقی سب سے ذرا سُست واقع ہوئی ہے۔ کوئی کام کرنا ہو، شام کے وقت سب کو جنگل کی سیر کرنی ہو، سنہری چڑیا جلدی تھک جاتی اور پھر کچھ ہی دیر بعد واپس اپنے گھونسلے میں چلی آتی۔ سب بڑے بزرگوں نے اُسے بہت بار پیار سے، غصے سے سمجھایا، لیکن سنہری چڑیا اُن کی بات کو ایک کان سے سُن کر دوسرے کان سے نکال دیتی۔

اس مرتبہ بھی اس کا وہی پرانا معمول رہا ہے۔ گرمی جیسے جیسے شدت پکڑتی جارہی ہے سب نے ہی دِن میں دو سے تین بار نہانے کو اپنا معمول بنالیا ہے، اِس لیے وہ سب صحت و تن درستی والی زندگی گزار رہے ہیں۔

سنہری چڑیا کی ایک انوکھی منطق ہے کہ اُسے پانی ضائع کرنا اچھا نہیں لگتا ہے اور اُسے پانی سے ڈر بھی بہت لگتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ ہفتے میں صرف ایک دِن ہی نہانا پسند کرتی ہے۔ سب نے بارہا اسے سمجھایا ہے کہ خود کو صاف ستھرا رکھنے کے ساتھ ساتھ خود کو صحت مند رکھنا بھی نہایت ضروری ہے۔ اگر صحت اچھی ہوگی تو مختلف بیماریوں سے لڑنے کی طاقت اور توانائی بھی جسم میں ہوگی اور موسمی بیماریوں کے اثرات بھی کم ہوں گے، لیکن اُس نے کسی کی بھی بات پر کان نہیں دھرے۔

کچھ ہفتے تو سکون سے گزر گئے، لیکن جب گرمی نے زور پکڑا تو جنگل میں ہر کوئی پریشان نظر آنے لگا۔ سب اپنے گھروں تک محدود ہونے لگے اور دور دراز علاقوں میں جانے سے اجتناب کرنے لگے۔ سب نے اُن تمام احتیاطی تدابیر پر عمل کیا جن کے ذریعے وہ گرمی کی شدت سے بچ سکتے تھے۔ سنہری چڑیا اِس سب سے بے خبر گھر میں آرام کرتی رہتی، کبھی کبھار دِل کرتا تو ساتھ والے درختوں کی سیر کر آتی۔

ایک صبح سنہری چڑیا نیند سے جاگی تو اُسے اپنے جسم پر دو ننھے ننھے دانے نظر آئے۔ اُس نے اپنی امی کو بتایا تو اُنھوں نے کہا کہ اگر تم ہر روز نہانا

شروع کردو اور خود کو صاف ستھرا رکھو تو دیکھنا بہت جلد یہ دانے ختم ہو جائیں گے۔

سنہری چڑیا نے سوچا، چلو آج نہا ہی لیتی ہوں۔ یہ سوچ کر وہ نزدیک بنے تالاب کی طرف آئی۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کی ہم عمر چڑیاں مزے سے پانی میں غوطے لگا رہی ہیں۔ وہ سوچنے لگی: ''پتا نہیں، انھیں پانی سے ڈر کیوں نہیں لگتا اور مجھے کیوں لگتا ہے؟ اپنا خیال رکھتی تو ہوں میں، کھلی فضا میں وقت گزارتی ہوں، اب اور کیا کروں۔'' اُس نے جھنجھلا کر سوچا۔

کچھ دیر بعد سنہری چڑیا نے اپنے پَر کھولے اور اُڑ کر واپس گھر آ گئی۔ دو دِن بعد وہ دانے بڑے ہو گئے اور اُن کی وجہ سے اُس کے جسم میں درد شروع ہو گیا ہے اُس کے ابو اُسے بستی کے کلینک انکل شوم چڑے کے پاس لے گئے۔ اُنھوں نے سنہری چڑیا سے کچھ سوال کیے۔

''کب سے دانے ہو رہے ہیں آپ کو؟''

''تین دِن ہو گئے ہیں۔ پہلے تو تکلیف نہیں ہو رہی تھی، لیکن اب بہت درد ہو رہا ہے۔'' اُس نے روتے ہوئے جواب دیا۔

''ارے، رو نہیں، آپ تو بہت بہادر ہو۔ چلو شاباش، آنسو صاف کرو، میں ابھی دوائی دوں گا اور دیکھنا آپ جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔'' انکل شوم نے سنہری چڑیا کو تسلی دی۔

''واہ کیا خوب کہنے! بہادر اور ہماری بیٹی؟ بھئی آپ مجھے خود بتائیں جسے پانی سے ڈر لگتا ہو، جو ہفتے میں صرف ایک بار ہی نہانا ضروری سمجھتی ہو، وہ کہاں سے بہادر ہو گئی؟'' اُس کے ابو نے سنہری چڑیا کی بہادری پر روشنی ڈالی۔

''ارے، پانی سے ڈر لگتا ہے! اچھا اب میں سمجھا کہ آپ کو یہ دانے کیوں نکلے ہیں۔ اگر ہم ہر روز نہائیں گے نہیں تو ہمارے جسم پر پسینے کی تہ جمنا شروع ہو جائے گی، جس کی وجہ سے ہمیں خارش اور گرمی دانے ہو جاتے ہیں، ہماری صحت بھی متاثر ہوتی ہے اور ہم سستی اور کاہلی کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ جب جسم میں طاقت ہی نہ ہو گی تو ہم اپنے باقی کام کس طرح اَنجام دے سکتے ہیں؟ پانی تو بہت اچھا ہوتا ہے، یہ تو ایک ایسی نعمت ہے جس کا کوئی نعم البدل بھی نہیں ہے۔ خالق کی قدرت دیکھیں کہ اُس نے ہر موسم میں ہمیں پانی کی نعمت سے نوازا ہے۔''

''انکل شوم! آپ درست فرما رہے ہیں، لیکن مجھے لگتا ہے کہ ہر روز نہانے سے بہت سا پانی ضائع ہو جاتا ہے، بس اِس لیے میں.....'' وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی، جب کہ اُس کی بات پر ڈاکٹر انکل مسکرانے لگے۔

''آپ کی بات ٹھیک ہے کہ پانی کو ضائع نہیں کرنا چاہیے، لیکن اگر ہم اُس کا استعمال صحیح طریقے سے کریں تو پانی کو محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ اب آپ خود ہی دیکھ لیں کہ ہر روز نہ نہانے کی وجہ سے آپ بیمار پڑ گئی ہیں، اور تکلیف بھی الگ ہے، اِس بات کا مطلب ہوا کہ.....''

''کہ ہر روز نہانے سے، خود کو صاف ستھرا رکھنے سے بہت سی بیماریاں ہم سے دور رہتی ہیں۔'' سنہری چڑیا نے ڈاکٹر انکل کا جملہ پورا کیا تو ڈاکٹر انکل اور اُس کے ابا، دونوں ہنسنے لگے۔

''اور سب سے اہم بات یہ کہ آپ کو کڑوی دوائیاں بھی نہیں کھانی پڑتیں۔'' ڈاکٹر انکل نے یہ کہتے ہوئے ایک سیرپ اُس کے ابو کو تھما دیا۔

''یہ سیرپ دِن میں تین مرتبہ استعمال کرنا ہے، یعنی صبح، دوپہر اور شام کے وقت۔ جیسے ہی تکلیف کچھ کم ہو سنہری چڑیا کو آپ تالاب پر لے جایئے گا۔ مجھے یقین ہے کہ اب اِسے پانی سے ڈر نہیں لگے گا۔'' ڈاکٹر شوم نے سنہری چڑیا کی طرف دیکھا۔

''تھوڑا سا لگے گا بس۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ وہ گھر آ گئے۔ چڑیا دوائی وقت پر پیتی رہی۔ اگلے دن شام تک درد کی شدت میں کمی آ چکی تھی۔ جب اُس کی امی تالاب کی طرف جانے لگیں تو وہ بھی جلدی سے اُن کے پاس آئی اور بولی:

''امی جان! آج سے میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی۔ میں معذرت چاہتی ہوں کہ میں نے آپ کی بات نہیں مانی، جس کی وجہ سے مجھے تکلیف کا سامنا کرنا پڑا، لیکن اب میری سمجھ میں آ گیا ہے کہ آپ سب بالکل صحیح کہتے تھے، اِس لیے اب آپ جو کہیں گی وہ میں مانوں گی۔''

سنہری چڑیا کی بات سن کر اُس کی امی بہت خوش ہوئیں اور اُسے ساتھ لے کر تالاب کی طرف آ گئیں۔ وہاں موجود سب چڑیاں سنہری چڑیا کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

سنہری چڑیا اپنی امی کے ساتھ تالاب میں اُتری تو ڈر کے مارے اُس کی چیخ نکل گئی، لیکن پھر جب اُس نے اپنی امی کو اپنے ساتھ دیکھا اور باقی سب چڑیاں بھی اُس کے اردگرد نہاتی نظر آئیں تو اُسے کچھ ہمت ہوئی۔ چند لمحوں میں وہ سب کی طرح خوشی خوشی تالاب میں غوطے لگا رہی تھی۔ ہر بار غوطہ لگانے سے پہلے وہ ایک ہی جملہ بولتی:

''پانی تو اچھا ہے، پانی تو اچھا ہے۔'' اور شڑاپ سے پانی میں ڈوب جاتی۔ سب چڑیاں اُس کا یہ جملہ سُن کر ہنسنے لگیں۔

تتلی

محمد ایوب اختر۔ لیاقت پور

باغ میں اڑتی دیکھی تتلی
بچوں نے وہ پکڑی تتلی

رنگ برنگے اس کے پر تھے
پنکھ مگر وہ نازک تر تھے

رنگ تھے اُس کے پیارے پیارے
بچتے تھے سارے کے سارے

خوش تھے بچے تتلی پاکر
اس کو اپنے گھر میں لاکر

ایک مگر حساس تھا بچہ
بچوں میں وہ خاص تھا بچہ

بیٹھا جو افسردہ تھا اب
خاصا وہ آزردہ تھا اب

ننھی سی یہ پیاری تتلی
بے بس اور بے چاری تتلی

کیسے اپنے گھر جائے گی
پر ٹوٹے تو مر جائے گی

بچوں کو پھر چکما دے کر
تتلی اپنے ہاتھ میں لے کر

یک دم دور اڑائی اس نے
یوں اک جان بچائی اس نے

خوش بو کہاں سے آئی؟

فاتح کون ۲

۲

نذیر انبالوی۔ لاہور

''عادل! عادل بیٹا! آنکھوں کھولو، ہوش میں آؤ۔ ظفر! ظفر!''

امی جان نے عادل کو ہوش میں لانے کی کوشش کی۔

چند ساعتوں بعد ظفر بھی کمرے میں پہنچ چکا تھا۔

''جی مالکن!'' ظفر بولا۔

''دیکھو، عادل بے ہوش ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو فون کرو، جلدی کرو۔''

امی جان نے روتے ہوئے کہا۔

''جی جی، میں ابھی ڈاکٹر صاحب کو فون کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر ظفر کمرے سے باہر چلا گیا۔ شرشر اور غصہ ابھی بھی کمرے میں موجود تھے۔

''تمھاری آواز سُن کر عادل بے ہوش ہوا ہے۔''

غصے نے شرشر کو گھورا۔

''اس نے پہلی بار میری آواز سُنی ہے۔ جب یہ میری آواز سننے اور مجھے دیکھنے کا عادی ہوجائے گا تو پھر بے ہوش نہیں ہوگا۔ لو، یہ ابھی ہوش میں آجاتا ہے۔'' یہ کہہ کر شرشر عادل پر جھک گیا۔

''عادل! عادل! آنکھیں کھولو، مجھ سے ڈرو مت، میں تمھارا دشمن نہیں، دوست ہوں، آنکھیں کھولو۔''

شرشر کے ہلانے پر عادل نے ہولے ہولے آنکھیں کھولیں تو ایک طرف امی جان اور دوسری طرف شرشر اور غصہ موجود تھے۔

شرشر کو دیکھ کر عادل ایک مرتبہ پھر ڈر کے مارے بے ہوش ہوگیا۔

شرشر نے اسے دوبارہ ہوش دلایا۔

''ڈرو مت، آنکھیں کھولو۔'' شرشر نے عادل کو مخاطب کیا۔

''جاؤ، یہاں سے تم بہت ڈراؤنے اور بدصورت ہو، چلے جاؤ یہاں سے۔''

عادل چلایا۔

''کون چلا جائے؟ کس سے باتیں کر رہے ہو؟''

امی جان نے محبت سے عادل کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''وہ..... وہ..... میں..... ہاں، کچھ نہیں، اسے کہو، یہ یہاں سے جائے، میں اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔''

عادل نے دوبارہ آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

''یہاں تو کوئی بھی نہیں میرے بیٹے! تمھیں کیا ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب بھی نہ جانے کہاں رہ گئے ہیں!؟ میرے اللہ! رحم فرما، میرے اللہ! اپنا فضل فرما۔''

یہ کہتے ہوئے امی جان پھر رو پڑیں۔

غصے اور شرشر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''ہمارا یہاں سے جانا ہی بہتر ہے، یہ ذرا سنبھل جائے تو ہم دوبارہ آجائیں گے۔ آؤ، یہاں سے چلتے ہیں۔'' شرشر نے غصے کا ہاتھ پکڑا تو اُس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

''میں کہیں نہیں جا رہا، عادل کو میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا، کسی وقت بھی تحمل اور برداشت کی آمد ہوسکتی ہے، میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ یہاں

آ کر عادل کو اپنی پناہ میں لے لیں، یہ میرا شکار ہے، اسے انجام تک میں خود ہی پہنچاؤں گا اور ملکہ بدی سے انعام پاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے، میں تو جا رہا ہوں۔ اگر میری مدد کی ضرورت پڑے تو بلند آواز سے شرشر کہنا، میں حاضر ہو جاؤں گا۔''

آخری جملہ ادا کرتے ہی شرشر ایک جھٹکے سے غائب ہو گیا۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر صاحب عادل کا معاینہ کرنے میں مصروف تھے۔

''لگتا ہے عادل کسی ذہنی پریشانی میں مبتلا ہے۔ گھر میں سب خیریت ہے نا!؟''

ڈاکٹر صاحب کی بات سُن کر امی جان پردے کی اوٹ سے بولیں:

''گھر میں تو سب ٹھیک ہے۔ وہ دراصل عادل نے گھریلو ملازم ظفر کو تھپڑ مارا تھا۔''

''وہ کیوں!؟ ظفر تو بہت اچھا ہے۔ ہر کام طریقے اور سلیقے سے کرتا ہے، ہوا کیا ہے؟''

ڈاکٹر صاحب کے سوال پر میں امی جان نے ساری بات انھیں بتا دی۔

''اچھا، تو یہ معاملہ ہے، عادل نے شاید اِس بات کا اثر اپنے دماغ پر لے لیا ہے، میں دوا لکھ رہا ہوں، دوا سے غنودگی طاری ہو گی۔ یہ ذرا آرام کر لے گا تو اِس کی حالت قدرے بہتر ہو جائے گی۔'' ڈاکٹر صاحب بولے۔

.....☆.....

کمرے میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ عادل پر دوا نے اثر دکھایا تو وہ بے سدھ ہو گیا۔ غصہ ایک طرف بیٹھا ہوا تھا۔

اسی اثنا میں ظفر کمرے میں داخل ہوا۔ وہ عادل کے بستر کے پاس کھڑے ہو کر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگا۔ وہ کافی دیر تک منہ میں کچھ پڑھتا رہا، پھر اُس نے عادل پر پھونک ماری تو اچانک عادل کی آنکھ کھل گئی۔ عادل نے آنکھیں ملتے ہوئے ظفر کی دیکھا۔

''تم میرے کمرے میں کیا کر رہے ہو؟''

''وہ چھوٹے مالک! وہ میں.....'' ظفر یہ بتانا نہیں چاہتا تھا کہ وہ کمرے میں کیوں آیا تھا۔

''میں بتاتا ہوں، یہ کمرے میں کیوں آیا تھا؟''

غصہ، عادل کے سامنے آ گیا، ظفر اُسے دیکھ نہیں پا رہا تھا۔

''بتاؤ، یہ یہاں کیوں آیا تھا؟''

عادل اب ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔

''یہ منہ میں نجانے کیا پڑھتا رہا اور پھر تم پر پھونکیں مارنے لگا، مجھے تو یہ جادو لگتا ہے۔''

''یہ..... یہ کون ہے جو میرے خلاف آپ کے کان بھر رہا ہے۔ میں تو آپ کی صحت یابی کے لیے قرآن مجید کی آیات پڑھ کر آپ پر پھونک رہا تھا۔ میں آپ پر کیوں جادو کروں گا، یہ غلط کہہ رہا ہے۔ چھوٹے صاحب! آپ میری بات کا یقین کریں۔'' ظفر نے اپنی صفائی پیش کی۔

عادل نے ایک نظر ظفر پر ڈالی اور پھر غصے کی طرف دیکھا۔

ظفر کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر عادل بے چین ہو گیا۔ وہ اب بھی منہ میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ عادل کے مارے گئے تھپڑ کا نشان اب تک اس کے رخسار پر تھا۔ اسے وہ تھپڑ یاد آ گیا جو ایک مرتبہ بغیر اُس کی غلطی کے اس کے نازک رخسار پر پڑا تھا۔

ظفر کو دیکھ کر عادل کو اچانک وہ تھپڑ اور اُس کی تکلیف یاد آ گئی۔

ظفر اَب بھی عادل کے سامنے کھڑا تھا۔ غصہ حیران تھا کہ عادل نے ظفر کو کمرے سے نکل جانے کے لیے کیوں نہیں کہا۔ ظفر کے ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے۔ وہ مسلسل کچھ پڑھ رہا تھا۔ اسی اثنا میں کمرے میں خوش بو پھیل گئی۔

عادل اور ظفر چونک اٹھے۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ اچانک کمرے میں یہ خوش بو کہاں سے آئی ہے؟

(خوش بو کہاں سے آئی؟ یہ جاننے کے لیے پڑھیے اگلی قسط)

خوش خبری

مقابلۂ خوش خطی ۱۳

طلباوطالبات کے لیے انعامات جیتنے کے مواقع

بارہ مہینے
بارہ انعامات

انعامات:

اول آنے پر 1000 روپے / دوم آنے پر 700 روپے

سوم آنے پر 500 روپے

مقابلے میں شریک ہونے کے لیے مندرجہ ذیل فن پارے کو لکھیے۔ جو قاری اس فن پارے کو عمدہ انداز میں لکھنے میں کام یاب ہوگیا، وہ انعام کا حق دار ہوگا۔

تو پھر دیر کس بات کی! اٹھایئے کاغذ اور قلم، کیجیے مشق..... اور ہمیں جلد از جلد ارسال کر دیجیے۔

مقابلے سے متعلق ضروری ہدایات:

☆ کمپیوٹر پیپر (A-4 سائز) صفحہ استعمال کیجیے۔

☆ فن پارے کو لکھنے کے لیے فونٹین پین، پنسل، کٹا ہوا پین اور کٹا ہوا مارکر استعمال کر سکتے ہیں۔

☆ کالی اور نیلی روشنائی استعمال کیجیے، کوئی اور رنگ بالکل استعمال نہ کیجیے۔

☆ صفحے کے چاروں جانب سے تقریباً ایک ایک انچ کا فاصلہ رکھ کر نمونہ تحریر کیجیے۔

زیرِ انتظام
شعبہ خوش خطی، البدر ہائر سیکنڈری اسکول

السّلام علیکُم ورحمۃُ اللہ وبرکاتہٗ

نوٹ: فن پارہ ۳۰ ستمبر ۲۰۲۱ء تک ہمیں موصول ہوجانا چاہیے۔ ایک فن پارہ ایک طالب علم کی طرف سے قبول کیا جائے گا۔ کمیٹی کا فیصلہ حتمی ہوگا، جس پر اعتراض قابل قبول نہیں ہوگا۔ مقررہ تاریخ کے بعد وصول ہونے والے فن پارے مقابلے میں شریک نہیں کیے جاسکیں گے۔

وقت کی چوری

ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی۔ تلہ گنگ

آج کا دن بچوں کے لیے بہت یادگار دن تھا۔ آج مدرسے کے سب بچے بہت خوش نظر آرہے تھے۔ ان کا سالانہ امتحان مکمل ہو چکا تھا، امتحان کا بوجھ سر سے اترنے اور اپنے اپنے گھر جانے کی خوشی میں وہ پھولے نہیں سما رہے تھے۔ صبح کا ناشتا کر کے وہ ایک دوسرے کے ساتھ ہنسی مذاق اور کھیل کود میں مصروف تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں مدرسے کا سالانہ جلسہ شروع ہونے والا تھا، جس میں چند بچوں کو تقریری اور تحریری مظاہرے بھی پیش کرنے تھے اور جلسہ کے اختتام پر پُرتکلف ظہرانے سے انھیں لطف اندوز بھی ہونا تھا۔ باورچی خانے سے بریانی اور میٹھے کی خوش بُو بچوں کی خوشیوں میں مزید اضافہ کر رہی تھی اور اَب وہ خراماں خراماں، کشاں کشاں جلسہ گاہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

بچوں کے پروگرام کی کارروائی بچوں کی انجمن الفلاح کے ناظم میاں مظفر نے شروع کی، جو بچوں میں بہت مقبول تھے۔ میاں مظفر، بڑی جماعتوں کے طلبہ اور اَساتذۂ کرام نے بہت محنت اور شفقت سے بچوں کو تیار کیا تھا۔ بچوں نے دھواں دھار تقریریں کیں، حمد اور نعت وغیرہ بھی بہت سلیقے سے پیش کیں۔

سب سے آخر میں مدرسے کے ناظم صاحب مائیک پر آئے۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں بچوں کی تعلیمی کارکردگی کا جائزہ لیا۔ نصاب کی تکمیل اور امتحان میں بچوں کے بہترین مظاہرے پر اطمینان کا اظہار کیا، اس کے ساتھ ہی انھوں نے طلبہ کو غیر نصابی کتب اور اَخبار و رسائل کے مطالعے کے لیے وقت نکالنے، بل کہ اس کے لیے ''چوری'' کی ترغیب دی۔

چوری کا لفظ سنتے ہی بچے چونک پڑے کہ آج ناظم صاحب کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ہمیں چوری کرنے کا کہہ رہے ہیں۔ انھوں نے مزید وضاحت کی:

''بچو! چوری، بہت بُری چیز ہے، لیکن آج میں آپ کو ایک ایسی چوری بتاؤں گا جو ہرگز بُری نہیں ہے، اس چوری کے ذریعے آپ کی شخصیت میں چار چاند لگ جائیں گے، آپ کا نام روشن ہوگا، آپ دنیا کے بڑے آدمیوں میں شمار کیے جائیں گے اور وہ ہے وقت کی چوری۔

آپ درسی کتب، کھیل کود اور دوستوں سے گپ شپ سے تھوڑا وقت چُرا کر اگر کتب خانے کی کتب اور رسائل اور اَخبارات کے مطالعے میں صرف کریں گے اور اپنے مطالعے میں وسعت دیں گے تو ایک دن آپ بڑے مصنف، مترجم، محقق اور قائد کی حیثیت سے پہچانے جائیں گے۔

آج آپ کو صرف اپنے پاس ہونے کی فکر ہے کہ اگر پاس نہیں ہوئے تو خوب بے عزتی ہوگی، لیکن یاد رکھیں! امتحان میں پاس ہونا اور مضامین کو سمجھنا، دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ایک بچہ اگر امتحان میں ۹۰، ۹۵ فی صد نمبرات حاصل کرتا ہے تو اِس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے تمام مضامین پر عبور ہے، ہو سکتا کہ اس نے محض رٹ کر اِمتحان پاس کیا ہو۔

اس کے برخلاف جس بچے نے رٹنے کے بجائے سمجھ کر اپنے الفاظ میں امتحان کے پرچے حل کیے ہوں، ہو سکتا ہے کہ اسے امتحان میں کم نمبرات حاصل ہوں، لیکن ایسا بچہ آگے چل کر بہت ترقی کرتا ہے۔

لیکن اپنے الفاظ میں امتحانی پرچے تحریر کرنے کے لیے لکھنے کی مشق ضروری ہے اور یہ مشق مضمون نویسی، کہانی نویسی، تقریر اور مباحثے کے مقابلوں میں حصہ لینے اور اپنے طور پر

بقیہ صفحہ نمبر 47 پر

قرآن کوئز ۱۳

سعد علی چھیپا۔ کراچی

عزیز قارئین! پیشِ خدمت ہے ایک نیا انعامی سلسلہ بنام ''قرآن کوئز''، جس میں آپ سے اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ''قرآن کریم'' کے بارے میں پانچ سوال پوچھے جائیں گے۔ صحیح جواب دینے پر آپ کو ملے گا بہترین انعام.....

تو دیجیے جواب اور لیجیے انعام.....

آپ کا جواب کوپن کے ساتھ ۳۰ ستمبر ۲۰۲۱ء تک ہمیں مل جانا چاہیے۔

سوال

۱ قرآن مجید کی کون کون سی سورتیں ''تبارک الذی'' سے شروع ہوتی ہیں؟

۲ قرآن مجید کی کون سی سورت ثواب میں ''ایک تہائی'' قرآن کے برابر ہے؟

۳ قرآن مجید کی کون سی سورت کا نام ایک دھات کے نام پر ہے؟

۴ قرآن مجید کی کون سی سورت ایک غزوے کے نام پر ہے؟

۵ قرآن مجید کی کون سی سورت آپ ﷺ کے قبیلے کے نام سے ہے؟

خونی جمناسٹر ۲

محمد واصف شیزار۔ کراچی

''یہ سب کیسے ہوا؟''

انسپکٹر غوری نے لاش کا بغور معاینہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''سر! میں صبح یہاں سے گزر رہا تھا تو مجھے صفائی والا یہاں نظر آیا، جو بہت دیر سے مسٹر فاخر کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا، مگر مسٹر فاخر نے دروازہ ہی نہیں کھولا، پھر میں نے صفائی والے سے کہا کہ کاؤنٹر سے جا کر ماسٹر چابی لے آؤ، تاکہ ہم مسٹر فاخر کے کمرے کا دروازہ کھول سکیں، مگر کریم خالی ہاتھ آیا۔''

''کیا مطلب، کریم خالی ہاتھ آیا؟''

انسپکٹر کاشف نے پوچھا۔

''سر! مطلب یہ کہ کاؤنٹر پر چابی نہیں تھی، گویا کہ چابی کاؤنٹر سے غائب تھی۔'' مسٹر اعظم بولے۔

''کیا!'' نہ صرف سب انسپکٹر کاشف، بل کہ انسپکٹر غوری بھی حیران رہ گئے۔

''پھر آپ نے دروازہ کیسے کھولا؟'' انسپکٹر غوری بولے۔

''سر! پھر میں نے کریم کے ذریعے مسٹر دانش کو بلوایا جو کہ اس ہوٹل کے منیجر ہیں اور ہم احتیاط کے طور پر اُن کے پاس ایک اور ماسٹر چابی رکھواتے ہیں۔ ہم نے دوسری چابی سے دروازہ کھولا اور سامنے بستر پر مسٹر فاخر کی بستر پر لاش پائی۔'' مسٹر اعظم بولتے چلے گئے۔

''مگر سر! ان کا قتل ہوا کس چیز سے ہے؟ یہاں نہ تو کوئی خنجر ہے اور نہ ہی کوئی اور چیز، بس ان کے منہ اور ناک سے خون بہہ رہا ہے۔'' انسپکٹر کاشف بولے۔

''پتا نہیں! صورتِ حال حد درجے پیچیدہ ہے۔ ویسے یہ مسٹر فاخر تھے کون؟ اور یہاں کیوں آئے تھے؟'' انسپکٹر غوری نے مسٹر اعظم سے پوچھا۔

''میں بتاتا ہوں۔'' ایک مسافر بولا۔

''آپ کی تعریف؟'' انسپکٹر غوری نے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام مظہر احمد ہے اور میں مسٹر فاخر کا ساتھی ہوں۔''

''اوہ!'' انسپکٹر غوری بولے۔

''ہم چار ساتھی ''وی۔ ایچ (V.H)'' انڈسٹری میں کام کرتے ہیں۔ انڈسٹری کے مالی مسائل اور ترقی کی بات چیت کے لیے ہم ہر سال چاروں ساتھی ہوٹل کراؤن میں جمع ہوتے ہیں۔'' مسٹر مظہر بولے۔

''تو آپ کے باقی تین ساتھی کہاں ہیں، جو ہر سال آپ کے ساتھ اِس ہوٹل میں جمع ہوتے ہیں؟'' انسپکٹر غوری نے پوچھا۔

''سر! یہ مسٹر عقیل ہیں، یہ کمرا نمبر 302 میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ یہ مسٹر کامران ہیں، یہ کمرا نمبر 303 میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور میں کمرا نمبر 304 میں ٹھہرا ہوا ہوں۔'' مسٹر مظہر نے باری باری سب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اور مسٹر فاخر ٹھہرے ہوئے تھے کمرا نمبر 305 میں۔'' سب انسپکٹر کاشف بولے۔

''ویسے مسٹر اعظم! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ پہلی ماسٹر چابی کیسے غائب ہوئی کاؤنٹر سے؟'' انسپکٹر غوری نے پوچھا۔

''سر! مجھے کیا معلوم؟ ان سب چیزوں کا حساب کتاب تو دانش رکھتا ہے۔'' مسٹر اعظم بولے۔

''منیجر صاحب! آپ کیا بتا سکتے ہیں کہ چابی کہاں گئی؟'' سب انسپکٹر کاشف نے منیجر مسٹر دانش سے پوچھا۔

''سر! آپ کیا مجھ پر شک کر رہے ہیں؟ مجھے بالکل نہیں معلوم کہ چابی کہاں گئی؟'' منیجر مسٹر دانش بولے۔

''ہوسکتا ہے کہ یہ کام آپ کے کاؤنٹر کلرک نے خود کیا ہو۔'' انسپکٹر غوری بولے۔

''ارے نہیں، نہیں سر! ہمارے کاؤنٹر کلرک ''عاصم احمد'' نے تو ایک ہفتے کی چھٹی لی ہوئی ہے، اس کے بدلے ہم نے دوسرا کاؤنٹر کلرک ''خاور'' رکھا ہوا ہے، جو کہ نہایت ایمان دار شخص ہے۔'' مسٹر اعظم بولے۔

''یہ کام مسٹر عاصم کا تو نہیں ہوسکتا، کیوں کہ اس نے تو ایک ہفتے کی چھٹی لی ہوئی ہے، البتہ یہ کام دوسرے کاؤنٹر کلرک خاور کا ہوسکتا ہے۔'' سب انسپکٹر کاشف بولے۔

''نہیں جناب! جیسا کہ میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ وہ نہایت ہی ایمان دار شخص ہے۔'' مسٹر اعظم بولے۔

''ہم..... وہ تو ہم خود معلوم کرلیں گے۔'' انسپکٹر غوری بولے۔

''سب سے پہلے تو ہم آپ کے ہوٹل کی کل رات کی کیمرا ریکارڈنگ (Camera Recording) دیکھیں گے کہ کل رات کوئی مسٹر فاخر سے ملنے تو نہیں آیا یا پھر مسٹر فاخر کل رات کہیں گئے تو نہیں؟'' انسپکٹر غوری، مسٹر اعظم سے بولے۔

''ٹھیک ہے سر! میں ابھی کل رات کی کیمرا ریکارڈنگ آپ کو دکھاتا ہوں، آیئے میرے ساتھ۔'' مسٹر اعظم بولے۔

.....☆.....

''سر! یہ دیکھیے، یہ آدمی کل رات کو دو بجے ہاتھ میں کچھ اُٹھائے کمرا نمبر 302 میں گیا ہے۔'' سب انسپکٹر کاشف بولے۔

''کیا! قتل ہوا کمرا نمبر 305 میں اور یہ نقاب پوش گیا کمرا نمبر 302 میں، یعنی مسٹر عقیل کے کمرے میں۔'' انسپکٹر غوری کیمرا ریکارڈنگ کو بغور دیکھتے ہوئے بولے۔

''سر! یہ آدمی تقریباً ایک منٹ اندر رہا، پھر باہر آیا اور کمرے کا دروازہ اسی نے ماسٹر چابی سے کھولا۔'' سب انسپکٹر کاشف نے اس آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اوہ! لیکن یہ آدمی ہے کون سر!؟'' مسٹر اعظم نے بغور اِسکرین کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ ہمیں ضرور معلوم کرنا ہوگا۔'' انسپکٹر غوری بولے۔

''سر! یہ آدمی کل رات کو دو بجے کمرا نمبر 305 سے ہوتا ہوا دوسری منزل کے کمرا نمبر 207 میں گیا تھا۔'' سب انسپکٹر کاشف بولے۔

''کیا! مگر سر! کمرا نمبر 207 تو کافی عرصے سے بند ہے۔'' مسٹر اعظم بولے۔

''ہاں، شاید اُسے معلوم تھا کہ کمرا نمبر 207 کافی عرصے سے بند ہے۔ کل رات کو اِس نقاب پوش نے ماسٹر چابی کے ذریعے کمرا نمبر 207 کا دروازہ کھولا ہوگا اور صبح ہوتے ہی ہوٹل سے فرار ہوگیا ہوگا۔'' انسپکٹر غوری بولے۔

''ایک منٹ کاشف! ذرا ریکارڈنگ روکو۔'' انسپکٹر غوری بولے۔

''او کے سر! انسپکٹر کاشف نے ریکارڈنگ روک دی۔ یہ دیکھو کاشف! اس نقاب پوش کے بازو پر یہ کالا دھبا ہے، گویا کہ اس کا ہاتھ یہاں سے جلا ہوا ہے۔'' انسپکٹر غوری نے نقاب پوش کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ارے سر! یہ دھبا، یعنی کہ ایسا دھبا تو ہمارے پہلے کاؤنٹر کلرک مسٹر عاصم کے ہاتھ پر بھی ہے۔'' مسٹر اعظم بولے۔

''کیا!'' دونوں انسپکٹر بہت زور سے چلائے۔

''یعنی کہ چھٹیاں لینے کے باوجود یہ اسی ہوٹل میں تھا؟'' انسپکٹر کاشف بولے۔

''اس کا پتا تو کاؤنٹر کلرک عاصم سے ملنے کے بعد ہی چلے گا۔'' انسپکٹر غوری بولے۔

''مگر سر! عاصم اس ہوٹل میں تھا تو کیا یہاں کے ملازموں نے اسے دیکھ کر پہچانا نہیں ہوگا؟'' سب انسپکٹر کاشف بولے۔

''مسٹر عقیل کے کمرے میں تو وہ نقاب لگا کر گیا تھا، اور ویسے وہ نقلی چہرہ لگا لیتا ہوگا۔'' انسپکٹر غوری بولے۔

''کچھ اور تو ریکارڈنگ میں نظر آیا؟ میرا مطلب ہے کہ مسٹر فاخر سے کوئی ملنے تو نہیں آیا یا پھر وہ کہیں گئے تو نہیں؟'' انسپکٹر غوری بولے۔

''نہیں سر!'' سب انسپکٹر کاشف بولے۔

''مسٹر اعظم! کیا آپ ہمیں عاصم کا پتا بتا سکتے ہیں؟ تاکہ ہم وہاں جا کر اپنی تفتیش کریں۔'' انسپکٹر غوری بولے۔

''جی سر! کیوں نہیں! مسٹر عاصم اے۔ ٹو۔ شمشاد ٹاؤن میں رہتے ہیں۔'' مسٹر اعظم بولے۔

''ٹھیک ہے۔'' سب انسپکٹر کاشف بولے۔

''کاشف! ہم ایک بات تو بھول ہی گئے۔'' انسپکٹر غوری بولے۔

''وہ کیا سر!؟'' سب انسپکٹر کاشف نے کہا۔

''وہ یہ کہ ہم نے ریکارڈنگ میں دیکھا تھا کہ عاصم اپنے ہاتھ میں کچھ اٹھائے ہوئے تھا، مگر جب وہ کمرے سے باہر آیا تو اُس کے ہاتھ خالی تھے، گویا کہ اس نے وہ چیز کمرا نمبر 302 میں رکھی تھی۔'' انسپکٹر غوری بولے۔

''اوہ سر! اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا۔''

''کاشف ایک کام کرو، میں مسٹر عاصم کے گھر سے تفتیش کر کے آتا ہوں۔ تم مسٹر عقیل سے پوچھ گچھ کرو کہ وہ، یعنی مسٹر عاصم کل رات دو بجے ان کے کمرے میں کیوں گئے؟'' انسپکٹر غوری بولے۔

''ٹھیک ہے سر!'' سب انسپکٹر کاشف بولے۔

.....(جاری ہے).....

پاکستان جاں بازوں کی سرزمین

ام محمد عبداللہ۔ جہانگیرہ

''نانا جان! یہ دیکھیں۔'' شہریار نے قالین پر ایک لمبی چھلانگ لگائی۔

''یہ بھی دیکھیں، اور یہ دیکھیں۔'' شہریار اپنے تئیں خوب جوش و خروش کے ساتھ چھلانگیں لگا لگا کر اپنے نانا جان کو متاثر کر رہا تھا۔

وہ عید کی چھٹیاں منانے کے لیے اپنے ننھیال آیا ہوا تھا اور بہت خوش تھا۔

''ارے بھئی واہ! بہت خوب!'' نانا جان، آٹھ سالہ نواسے کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے بولے۔ وہ بھی اپنے اس چھوٹے مہمان کی آمد سے خود میں تازگی محسوس کر رہے تھے۔

''آپ کو پتا ہے میں بڑا ہو کر کیا بنوں گا؟'' شہریار اَب نانا جان کے بازو کے ساتھ جھولنے لگا۔

''کیا؟'' نانا جان نے محبت سے اس کا گال چھوا۔

''میں بڑا ہو کر اِسپائڈر مین بنوں گا۔''

''ہائیں!'' نانا جان کو تو جیسے کرنٹ سا لگا۔

''بڑا ہو کر شہریار کیا بنے گا؟'' انھوں نے بے یقینی سے نواسے کی طرف دیکھا، جیسے تسلی کرنا چاہتے ہوں کہ وہ ابھی ابھی کیا کہہ رہا تھا۔

''نانا جان! اسپائڈر مین۔ یہ دیکھیں میری قمیص، سینڈل اور گھڑی۔'' انھوں نے دیکھا، سب پر اِسپائڈر مین کی مختلف تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ میرے شہریار کا ہیرو اِسپائڈر مین ہے۔ نانا جان گویا شدید صدمے کی حالت میں شہریار کو دیکھنے لگے۔

آئندہ چند دنوں تک وہ اسے جرات کی ایک داستاں سناتے رہے۔ محمد محمود عالم (ایم۔ ایم۔ عالم) ہماری ملی تاریخ کے ایک ناقابل فراموش اور زندہ و جاوید کردار ہیں۔ ان کا بچپن کتاب دوست بچپن تھا۔ نصابی، ہم نصابی اور کھیل کے میدان میں ہمیشہ نمایاں رہنے والا یہ بچہ فضا میں پرواز کرتے جہازوں کو بہت شوق سے دیکھا کرتا اور پورے یقین کے ساتھ کہتا: ''ایک دن میں بھی ہوا میں پرواز کروں گا۔'' ان کی ذہانت کے پیش نظر اُنھیں ڈاکٹر، انجینئر بن کر عیش و آرام کے ساتھ زندگی گزارنے کے مشورے ملتے، لیکن وہ مسکرا دیتے۔ عیش و آرام کے ساتھ زندگی گزارنا ان کا مقصد حیات نہ تھا۔ ان کا نصب العین تھا، ملک و قوم کا دفاع۔

۲، اکتوبر ۱۹۵۳ء کو اُنھیں پاک فضائیہ میں کمیشن ملا۔ انھوں نے یہاں کئی کام یاب کورس کیے۔ یہ ہوائیں، فضائیں ان کے سامنے مسخر تھیں۔ وہ کسی شاہین کی مانند بلند سے بلند تر پرواز کی طرف بڑھتے۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے یہ آفاق ان کی پرواز سے مسخر ہونے کو بے قرار ہیں۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

۶، ستمبر ۱۹۶۵ء کو بھارت کی بزدل فوج نے رات کے اندھیرے میں پاکستان پر اچانک حملہ کر دیا۔ بزدل اور عیار دشمن نہیں جانتا تھا کہ ہم نے اپنے دامن میں ایم۔ ایم۔ عالم جیسے گوہر نایاب سمیٹ رکھے ہیں۔

۷، ستمبر ۱۹۶۵ء کو بھارت کے دس ہنٹر طیارے سرگودھا کے ہوائی اڈے کو نشانہ بنانے کے لیے بھیجے گئے۔ سرگودھا کے ایئربیس پر پاک فضائیہ کی دفاع کے ذمے داری اسکواڈرن لیڈر ایم۔ ایم۔ عالم کے ذمے تھی۔ دشمن کے طیارے دیکھ کر اُن کے رگ و پے میں نئی طاقت بھر گئی۔ وہ پلٹ کر جھپٹنا اور جھپٹ کر پلٹنا کی مثال بن کر فضا میں اڑے۔ ان عظیم لمحوں کی داستان ان کے دوست امتیاز اَحمد بھٹی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''۷ ستمبر کی صبح تین بجے پہلا حملہ ہوا اور دوسرا دوپہر کے بعد سرگودھا پر کیا گیا۔ ہمیں فوری طور پر تیاری کا حکم ملا۔ بھارتی فوج چھے جہازوں

پر مشتمل فارمیشن میں حملہ کرتی تھی، جن میں سے چار جہاز حملے کے لیے استعمال ہوتے تھے، جب کہ بقیہ دو جہاز اُن چار جہازوں کے دفاع کے لیے ہوتے تھے۔

ہم نے حملہ شروع کیا تو کڑانہ پہاڑیوں پر ایک انڈین جہاز میرے حملے کی زد میں آیا۔ میں اس پر گولیاں برسانے لگا تو میں نے دیکھا کہ بھارتی جہاز کے عین نیچے ایم۔ایم۔عالم کا جہاز تھا، جس پر میں نے فوری طور پر فائرنگ کا ارادہ بدل دیا، تاہم ایم۔ایم۔عالم نے انڈین جہاز کو میزائل مار کر تباہ کر دیا۔ کچھ آگے تولائیاں کے مقام پر اِنڈین جہازوں پر مشتمل ایک اور فارمیشن سے ہماری مڈبھیڑ ہوگئی، جو کہ حملے کے لیے سرگودھا کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ایم۔ایم۔عالم نے اپنا جہاز اُن کے پیچھے لگا دیا اور اُن پر ہلہ بول دیا، جب کہ میں دیکھتا ہی رہ گیا، انھوں نے دشمن طیارے مار گرائے۔''

بعد میں معلوم ہوا کہ اس روز ایم۔ایم۔عالم نے محض تیس سیکنڈ میں دشمن کے پانچ طیارے تباہ کر کے عسکری تاریخ کا ایک ناقابل فراموش کارنامہ انجام دیا ہے۔ بعد میں یہ ریکارڈ مشہور عالمی جریدے ''گینیز بک آف ورلڈ ریکارڈ'' کا بھی حصہ بنا۔ انھیں اس عظیم کارنامے پر ستارۂ جرات عطا کیا گیا۔ انھوں نے مجموعی طور پر دشمن کے ۹ ہنٹر طیارے تباہ کیے تھے۔ اس جنگ میں ان کا ناقابل فراموش کردار اور جذبہ حب الوطنی ہم سب پاکستانیوں کے لیے مشعل راہ ہے۔''

اس داستان جرأت نے شہریار کے ننھے سے دل کو خوب متاثر کیا۔ اس وقت بھی شہریار پاک فضائیہ کیپ سر پر رکھے نانا جان کے ساتھ بہت شوق سے ایم۔ایم۔عالم ایئر بیس کی تصاویر دیکھ رہا تھا۔

''نانا جان! میں بڑا ہو کر اقبال کا شاہین بنوں گا۔ میں ایم۔ایم۔عالم کی طرح نئے عسکری ریکارڈ قائم کروں گا۔ میں اپنی سرحدوں اور فضاؤں کی حفاظت کروں گا ان شاء اللہ!'' نانا جان نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''اور وہ اسپائڈر مین کا کیا ہوا؟'' نانا جان نے مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا۔

''نانا جان! دیواروں اور چھتوں کے ساتھ لٹکنا، بیماریاں پھیلاتا دنیا کے سب گھروں میں سب سے کمزور گھر اِسپائڈر کا ہے۔ مجھے اسپائڈر مین نہیں بننا۔ مجھے مضبوط بننا ہے خود بھی اور مجھے مضبوط بنانا ہے اپنے پیارے وطن کو بھی۔ مجھے اپنے پیارے وطن کو اِسلام کا مضبوط قلعہ بنانا ہے۔''

شہریار ٹھہرے ہوئے لہجے میں متانت کے ساتھ بول رہا تھا، جیسے وہ ابھی سے پاک فضائیہ کا نڈر جاں باز بن چکا ہو۔

''ان شاء اللہ!'' نانا جان خوشی اور جوش سے بولے۔

بقیہ : وقت کی چوری

مضامین اور کہانیاں وغیرہ لکھنے کی مشق اور اِصلاح سے حاصل ہوتی ہے۔

آج بچے امتحان کا نام سنتے ہی گھبرا جاتے ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ مضمون کو سمجھ کر اپنے طور پر لکھنے کے بجائے کتابوں کو رٹ کر امتحان دیتے ہیں اور امتحان ہال میں مارے ڈر کے بھول جاتے ہیں، مگر کسی طرح الٹا سیدھا لکھ کر پاس ہو جاتے ہیں، لیکن امتحان گاہ سے نکلنے کے بعد اُنھیں مضمون کا کچھ حصہ بھی یاد نہیں ہوتا۔

اس کے برخلاف جو بچے مضمون اور کہانیاں لکھنے کے عادی ہوتے ہیں، وہ بڑے سے بڑے امتحان میں شرکت کرنے سے نہیں گھبراتے اور ہمیشہ اچھے نمبرات سے کام یاب ہوتے ہیں۔''

پھر حضرت ناظم صاحب نے بچوں سے عہد لیا کہ وہ آئندہ تعلیمی سال سے صرف رٹ کر امتحان پاس نہیں کریں گے، بل اپنی طرف سے امتحان میں سوالات کے جوابات تحریر کریں گے، اس کے لیے درسی کتب کے علاوہ معاون درسی کتب، ادبی کتب و رسائل وغیرہ کا مطالعہ ضرور کریں گے اور اس کے لیے اپنے نظام الاوقات (ٹائم ٹیبل) میں سے تھوڑا سا وقت چوری کریں گے، نہیں چوری نہیں، بل کہ اپنے نظام الاوقات میں سے تھوڑا وقت اور چھٹیوں کے زمانے میں زیادہ سے زیادہ وقت کتب و رسائل کے مطالعے میں صَرف کریں گے۔

چھٹیوں میں گھر جانے کے بعد اکثر بچوں نے ناظم صاحب کی نصیحتوں کو بھلا دیا، لیکن کئی ہونہار اور لائق بچوں نے نئے تعلیمی سال سے ناظم صاحب کے عہد پر عمل کیا۔ انھوں نے امتحان میں پچھلے سال کے مقابلے میں اچھے نمبرات حاصل کیے۔ انھیں لائبریری کی کتب و رسائل میں طرح طرح کے موضوعات پر دل چسپ مضامین، کہانیاں وغیرہ پڑھ کر بہت مزہ آنے لگا۔ وہ رات گئے تک لائبریری میں رہتے اور چھٹیوں میں اکثر وقت مطالعہ کرتے یا لکھنے میں مصروف رہتے۔ دوسرے بچے انھیں کتاب کا کیڑا کہہ کر چڑانے لگے، جب کہ وہ مدرسے کے دیواری جریدوں اور شہر کے اخبارات و رسائل میں اپنے مضامین اور کہانیاں دیکھ کر بہت خوش ہوتے اور اچھے سے اچھے رسائل میں اپنی تحریریں چھپوانے کی خاطر چھٹیوں میں بھی زیادہ تر وقت لکھنے پڑھنے میں گزارتے۔

مدرسے کے ناظم صاحب چوں کہ خود مشہور کالم نگار اور کئی کتابوں کے مصنّف تھے، وہ اپنے مدرسے کے لائق فرزندوں کی تحریریں اخبارات و رسائل میں دیکھ کر اُن بچوں سے بہت خوش رہنے لگے اور اُن کے لیے خصوصی وظیفہ مقرر فرمایا۔

مسکرائیے

قارئین

☆ ایک آدمی اپنے نجومی دوست کے پاس گیا اور اُس سے پوچھا: آج میں جس مقصد کے لیے گھر سے نکلا ہوں کیا وہ پورا ہوجائے گا؟''

نجومی نے کہا: ''ہاں، بالکل سو فی صد! آج کا دن تمھارے لیے بہت مبارک ہے۔''

دوست بولا: ''تو پھر نکالو میرے پانچ ہزار روپے، میں تم سے اپنے پانچ ہزار روپے واپس لینے آیا ہوں۔''

(محمد سفیان بن محمد ساجد۔ کراچی)

☆ کلاس میں دو لڑکے شور مچا رہے تھے کہ استاد آگئے۔ سزا کے طور پر اُستاد نے دونوں کو دو سو بار اپنا نام لکھنے کو کہا۔ ایک لڑکا لکھنے لگا، جب کہ دوسرا رونے لگا۔ استاد نے اس سے رونے کی وجہ پوچھی تو جواب ملا:

''سر! اس کا نام صرف ناصر ہے، جب کہ میرا نام محمد غیاث الدین ہے۔''

(ہدیٰ بنت محمد زبیر۔ کراچی)

☆ سپاہی (دیہاتی سے):

''تمھاری کھوئی ہوئی گائے کی کوئی نشانی ہے؟''

دیہاتی (سوچ کر): ''جناب! وہ دم ہلاتی ہے۔''

☆ ایک سیاح پہلی مرتبہ پاکستان آیا۔ ایک پھل کی دکان پر جا کر اُس نے کیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا: ''یہ کیا ہے؟''

دکان دار: ''یہ کیلے ہیں۔''

سیاح کہنے لگا: ''ہمارے ملک میں تو ڈیڑھ ڈیڑھ فٹ لمبے کیلے ہوتے ہیں۔'' پھر اُس نے سیب کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

دکان دار نے جواب دیا: ''یہ سیب ہیں۔''

سیاح جھٹ بولا: ''ہمارے ملک میں تو پانچ پانچ کلو کے سیب ہوتے ہیں۔''

پھر اُس نے تربوز کی طرف اشارہ کیا تو دکان دار عاجزی سے بولا:

''جناب! یہ انگور ہیں۔''

(عزیر اعجاز۔ حیدر آباد)

☆ ایک سیاست دان پہلی بار تقریر کرنے کے لیے اسٹیج پر آیا، تقریر لکھی ہوئی تھی۔ تقریر کرتے ہوئے جب پہلا صفحہ ختم ہوا تو الفاظ تھے: ''شیر جیسا بہادر انسان''، لیکن اس نے ایک صفحہ اُلٹنے کے بجائے گھبراہٹ میں دو صفحے الٹ دیے اور تقریر جاری رکھتے ہوئے بولا:

''انڈے سے نکلتا ہے۔''

(منال صادق۔ رحیم یار خان)

☆ دو پاگل بیٹھے تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا: ''اگر ایک ہاتھی درخت پر چڑھا ہوا ہے اور نیچے اُترنا چاہتا ہے تو اُسے کیا کرنا چاہیے؟''

پہلا پاگل (کچھ دیر سوچنے کے بعد): ''اسے چاہیے کہ کسی پتے پر بیٹھ کر خزاں کا انتظار کرے۔''

(ثقلین منیر۔ لودھراں)

☆ فٹ بال کے دو کھلاڑی باتیں کر رہے تھے۔ ایک بولا: ''میں نے ایک دن فٹ بال اتنی اونچی پھینکی کہ پورے دو گھنٹے بعد واپس آئی۔''

دوسرا بولا: ''یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے ایک دن فٹ بال اتنی اونچی پھینکی کہ وہ دو دن بعد واپس آئی اور اُس کے ساتھ ایک پرچی بھی تھی، جس پر لکھا تھا: یہ فٹ بال آئندہ چاند پر نہ آئے۔''

(عبدالرحمٰن۔ خانیوال)

☆ دو آدمی ریل کے ڈبے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد اُن میں سے ایک بولا:

''معاف کیجیے گا، میں کچھ اونچا سنتا ہوں، لیکن آج تو ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے میں بالکل ہی بہرا ہو گیا ہوں۔ آپ اتنی دیر سے باتیں کر رہے ہیں اور مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا۔''

دوسرا آدمی: ''جناب! میں باتیں نہیں کر رہا، چیونگم چبا رہا ہوں۔''

☆ مرغیاں پالنے کا ایک اشتہار دیکھ کر ایک صاحب کو مرغیاں پالنے کا شوق ہوا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اُنھوں نے منصوبہ بنایا۔ اس منصوبہ کے تحت انھیں ایک ملازم رکھنا تھا۔ اخبار میں اشتہار دیا گیا۔ ایک صاحب پہنچے، انٹرویو میں ان سے پوچھا گیا:

''کیوں میاں! مرغیوں سے کچھ دل چسپی ہے؟''

امیدوار نے جواب دیا:

''صاحب! میں تو غریب آدمی ہوں، آپ جو دیں گے کھا لوں گا۔''

(محمد سلمان۔ لوئر دیر)

میں مروں گا نہیں

الطاف حسین۔ کراچی

''لال بہادر شاستری'' کی بزدل فوج پاکستانی جاں بازوں کے ہاتھوں ''سبق آموز'' مار کھانے کے بعد پاکستان کے سرحدی گاؤں کا قبضہ چھوڑ کر بدحواس گیدڑ کی طرح بھاگ نکلی تھی۔ فضا جو کچھ دیر پہلے تک دِل ہلا دینے والے دھماکوں اور موت کی وحشت بھری چیخوں سے گونج رہی تھی، اب قدرے پُرسکون ہوچکی تھی، لیکن بارود کی ناگوار بُو نے ابھی تک ماحول کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔

ہندوستان کے جدید سنچورین ٹینکوں سے اُٹھتا دُھواں ان کی بربادی کا ماتم کررہا تھا۔ دشمن، ہندوستان جاتے جاتے اپنے پیچھے بے شمار لاشیں اور زخموں سے کراہتے وجودوں کو چھوڑنے کے ساتھ ساتھ متعدد مشین گنیں، رائفلیں اور دیگر جنگی ساز وسامان بطور ''بونس'' پاک فوج کے حوالے کر گیا تھا۔

اس وقت پاک فوج کی ایک کمپنی کی پلاٹون حکم کے مطابق گاؤں کی تلاشی لے رہی تھی۔ سپاہی علی جان کا تعلق بھی اسی پلاٹون سے تھا۔ اسے ٹریننگ سینٹر سے ''پاس آؤٹ'' ہونے کے فوراً بعد ہی محاذ جنگ پر بھیج دیا گیا تھا۔ علی جان تلاشی کی غرض سے ایک مکان میں داخل ہوا۔ وہاں معمولی سی تین چار پائیوں اور مٹی کے برتنوں کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔ اس نے دوسرے مکان میں قدم رکھا تو جہاں تھا وہیں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں نے ایسا ہوش رُبا منظر اِس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُس لاش کے قریب آ گیا، جو مویشیوں کی کُھرلی کے نزدیک پڑی تھی۔ اس کا سَر اور دونوں بازو جسم سے الگ کر دیے گئے تھے۔ علی جان کے ماتھے پر دِل کی کیفیت پسینا بن کر اُبھرنے لگی۔ وہ چند قدم اور آگے بڑھا تو باورچی خانے کے دروازے سے نظر آتے دو چھوٹے چھوٹے پاؤں نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا باورچی خانے تک آیا۔ دروازہ کھولا تو اُس کے دُکھ کی انتہا نہ رہی۔ وہ ایک ڈھائی سالہ معصوم بچے کی لاش تھی، جس کی دونوں ٹانگوں پر گولیوں کے نشان تھے۔ ٹانگوں سے نکلنے والا خون اب جم کر سیاہی مائل رنگت اختیار کر چکا تھا۔

علی جان نے کانپتے ہاتھوں سے بچے کی لاش اُٹھائی اور لڑکھڑاتے قدموں سے چلتا ہوا کُھرلی تک پہنچا اور بچے کو اُس لاش کے قریب رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ گھر کے ایک اور کمرے میں داخل ہوا۔ اسے وہاں غم کی کوئی تصویر دکھائی نہ دی تو وہ خاموشی سے باہر نکل آیا۔ اب اس کا رُخ دوسرے اور آخری کمرے کی طرف تھا۔ جوں ہی اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اس کی چیخ نکل گئی۔ اندر دو اور بچے بے حس و حرکت پڑے تھے۔ ایک کی عمر چھے سال کے لگ بھگ تھی، جب کہ دوسرا آٹھ سال کے لگ بھگ نظر آ رہا تھا۔ موت کی ان چار تصویروں کو دیکھنے کے بعد علی جان کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے جسم کے اندر بہت سے ٹینک دوڑ رہے ہیں اور دماغ میں مشین گنوں کی تڑتڑاہٹ گونج رہی ہے۔ اگلے لمحے وہ توپ کے گولے کی طرح پھٹا:

''نعرۂ تکبیر..... اللہ اکبر!''

اس کے بعد وہ بجلی کی تیزی سے دوڑتا ہوا اِس گھر سے باہر نکل آیا۔ وہ میدان جنگ میں اِدھر اُدھر دوڑتے ہوئے بدستور نعرے لگا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا دماغی توازن بگڑ گیا ہو۔

''علی جان! علی جان! کیا بات ہے؟ کیا ہوگیا ہے تمھیں؟''

ایک موقع پر جب وہ رکا تو اُس کے ایک ساتھی نے اسے پکڑ کر

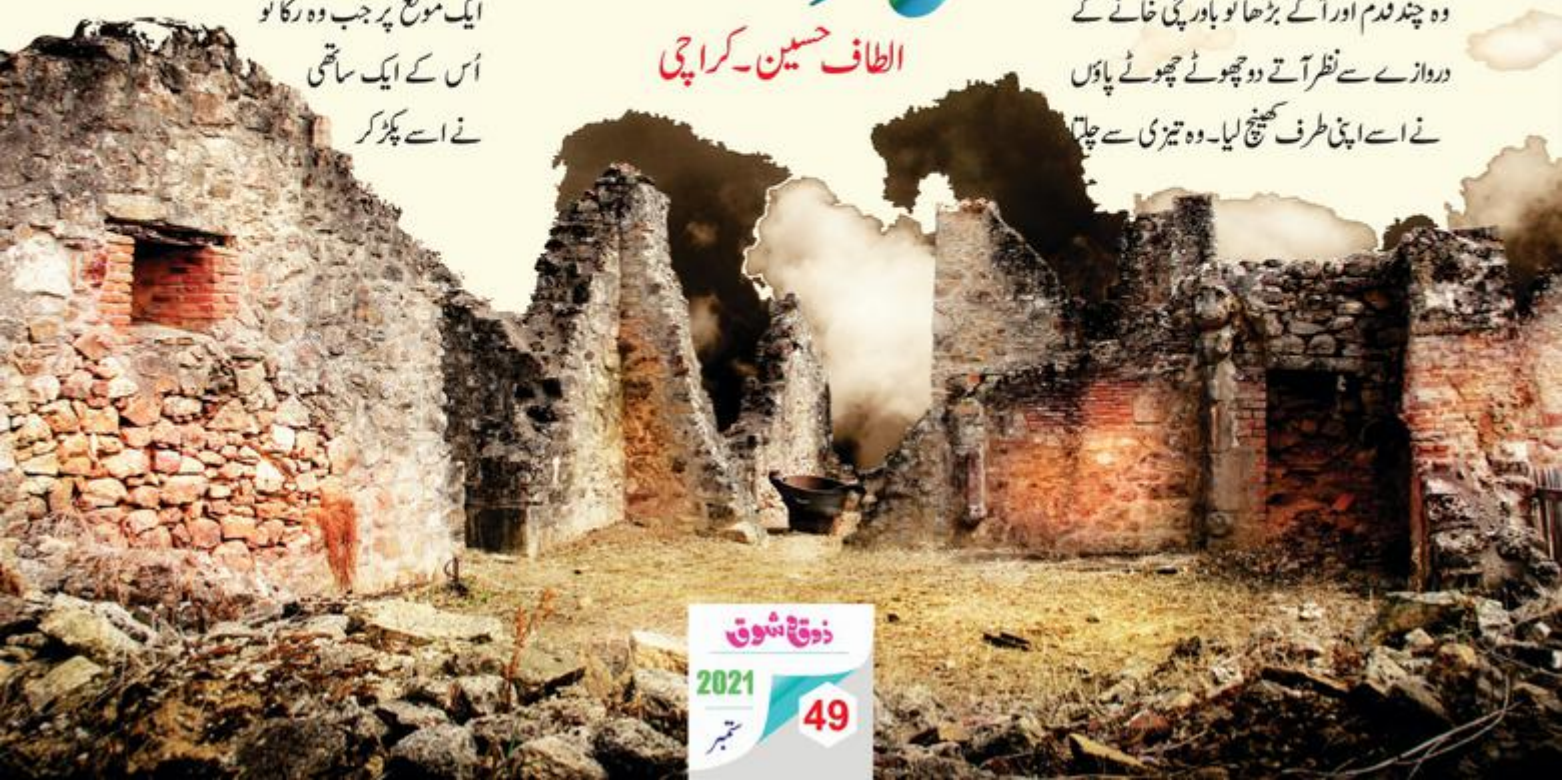

جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔ اتنے میں اس کے کچھ اور ساتھی بھی وہاں آ گئے۔

''نعرۂ ۂ ۂ ۂ تکبیر..... اللہ اکبر!'' علی جان نے اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے نعرہ لگایا اور غصے سے چیخا:

''میں انھیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں ان کی زندگی کو موت میں بدل دوں گا۔ اس کام میں مجھے اپنی جان بھی گنوانا پڑی تو گنوا دوں گا، لیکن انھیں چھوڑوں گا نہیں۔ میں نے جو کہا ہے ہر قیمت پر کر کے دَم لوں گا! ذرا ٹھہرو تو سہی۔ علی جان موت بن کر تم تک پہنچنے والا ہے۔''

''علی جان! تم پاگل تو نہیں ہو گئے؟'' ایک ساتھی نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کچھ دیر پہلے تو تم بالکل ٹھیک ٹھاک تھے۔''

''ہاں کچھ دیر پہلے تک واقعی میں ٹھیک تھا، لیکن اب میں ٹھیک نہیں ہوں۔ میں انھیں چھوڑوں گا نہیں۔''

علی جان کی دلی کیفیت میں ذرّہ برابر فرق نہیں آیا تھا۔

''یار! مجھے تو لگتا ہے یہ پاگل ہو گیا ہے!'' اس کا دوسرا ساتھی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہاں، ہاں، ہاں! میں پاگل ہو گیا ہوں!''

علی جان نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''تم بھی پاگل ہو جاؤ گے اگر اُس گھر میں پڑے چار بے گناہ لاشے دیکھ لو گے۔ انھیں دیکھنے کے بعد تم بھی ہوش کی باتیں نہیں کرو گے۔ انتقام کی آگ تمھیں بھی میری طرح بے چین کر دے گی۔''

''اسے فوراً ہسپتال لے چلو۔'' تیسرے سپاہی نے رائے دیتے ہوئے علی جان کو پکڑ لیا۔

''مجھے چھوڑ دو، مجھے چھوڑ دو۔ میں ان ظالموں پر زندگی تنگ کر دوں گا، جنھوں نے میری قوم کے بے گناہوں کے لہو سے ہاتھ رنگے ہیں۔ اگلا پچھلا حساب بے باق نہ کر دوں تو میں میرا نام علی جان نہیں۔'' علی جان دیوانوں کی طرح چلّا رہا تھا۔

''علی جان!'' کسی نے اس کے کندھے پر پیار بھرے انداز میں ہاتھ رکھتے ہوئے اس کا نام پکارا۔ علی جان نے فوراً گھوم کر آواز کی سمت دیکھا تو اُس کے سامنے اس کے پلاٹون کمانڈر صوبے دار غازی کمال کھڑے تھے۔

''بیٹے! تم ضرور دشمن سے انتقام لینا، تمھیں کوئی نہیں روکے گا، لیکن باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ، اس طرح تم زیادہ دشمنوں کو ختم کر سکو گے۔''

پلاٹون کمانڈر اُسے سمجھاتے ہوئے بولے۔ ''جلد بازی سے تم دشمن کے بجائے خود کو نقصان پہنچا دو گے۔''

''صاحب! آپ مجھے کسی مشن پر بھیجنے کا بندوبست کر دیں۔ میں آپ کا زندگی کے آخری سانس تک احسان مند رہوں گا۔ صاحب! آج رات جو پارٹی ٹینکوں کے شکار پر جا رہی ہے آپ میرا نام اس میں شامل کرا دیں۔ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔ صاحب! آپ مجھ پر یہ احسان کریں گے نا!؟'' علی جان بات ختم کرنے کے بعد اپنے پلاٹون کمانڈر کی طرف پُرامید نظروں سے دیکھنے لگا۔

''ٹھیک ہے۔ میں آج صاحب سے اس سلسلے میں ضرور بات کروں گا، لیکن تم اب خاموشی سے بیٹھ جاؤ۔ میں تمھاری دِلی کیفیت کو اچھی طرح سمجھتا ہوں، لیکن پھر بھی تمھیں حوصلے اور صبر سے کام لینا ہوگا۔'' پلاٹون کمانڈر شفقت بھرے انداز میں بولے۔

''بہتر صاحب! جیسا آپ نے کہا ہے میں ویسا ہی کروں گا۔'' علی جان نے سعادت مندی سے کہا۔

''شاباش بیٹے! خوش رہو۔'' پلاٹون کمانڈر معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولے۔ ''اب میں چلتا ہوں۔ ان شاء اللہ! اب رات کو ملاقات ہوگی۔''

پلاٹون کمانڈر باتوں باتوں میں علی جان کو ''خوش خبری'' دے گئے تھے۔

.....☆.....

جنگ کے دوران میں مخالفین ایک دوسرے کے ٹینکوں کو تباہ کرنے کے لیے باقاعدہ ''ٹینک ہنٹنگ پارٹیاں'' تشکیل دیتے ہیں۔ یہ عمل رات کے اندھیرے میں انجام دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رات کے اندھیرے میں ٹینک جنگی کارروائی میں حصہ لینے کے قابل نہیں رہتے، یعنی ''اندھے'' ہو جاتے ہیں۔ انھیں شام کے بعد جوں ہی تاریکی چھا جاتی ہے، اگلے مورچوں سے دُور پیچھے لے جا کر گھنے درختوں کی آڑ میں چھپا دیا جاتا ہے۔ فوجی اصطلاح میں یہ عمل ''لیگر'' کہلاتا ہے۔ تفصیلی معلومات نہ ہونے کی وجہ سے دُور مار توپوں کے ذریعے ان پر درست گولہ باری کرنا مشکل ہوتا ہے، لہٰذا بہتر نتائج حاصل کرنے کے لیے رات کے اندھیرے میں ''ٹینک ہنٹنگ پارٹیاں'' بھیجی جاتی ہیں، جو آٹھ سے دس جاں بازوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ یہ ''ٹینک ہنٹنگ پارٹیاں'' انتہائی خطرناک حالات میں جان ہتھیلی پر رکھ کر دشمن کے پھیلائے ہوئے حفاظتی اقدامات سے بچتی بچاتی اگلے مورچوں سے دُور پیچھے چھپائے گئے

ٹینکوں تک پہنچ کر انھیں تباہ و برباد کر دیتی ہیں۔ اس مہم پر جانے والوں میں سے بہت کم جاں باز زندہ واپس آتے ہیں۔

.....☆.....

رات کے ٹھیک بارہ بجے وہ آٹھوں ایک کندھے پر راکٹ لانچر اُٹھائے اور دوسرے کندھے پر فوجی تھیلا لٹکائے کمپنی کمانڈر کے سامنے مؤدبانہ انداز میں کھڑے تھے۔ ان میں علی جان بھی شامل تھا۔ اس کی قسمت اور جذبہ، دونوں اپنا رنگ دکھا گئے تھے۔ پلاٹون کمانڈر کے بے حد اِصرار پر کمپنی کمانڈر نے ایک جوان کا نام فہرست سے خارج کر کے اس کی جگہ علی جان کو ''ٹینک ہنٹنگ پارٹی'' میں شامل کرنے کی منظوری دے دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت وہ سب سے زیادہ خوش دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے کمپنی کمانڈر کے بائیں جانب کھڑے اپنے پلاٹون کمانڈر کا نظروں ہی نظروں میں کئی بار شکریہ ادا کیا تھا۔

''میرے بہادر اور شیر دِل جوانو!'' کمپنی کمانڈر اُنھیں مخاطب کرتے ہوئے بولے۔ ''آپ کو جس عظیم مشن پر بھیجا جا رہا ہے اس کی نزاکت اور اہمیت کا آپ سب کو بخوبی اندازہ ہے۔ آپ سب یہ بھی جانتے ہیں کہ ہمارے دشمن کے پاس ہزار سے زیادہ جدید سنچورئین ٹینک ہیں، جب کہ ہمارے پاس ان کے مقابلے میں ٹینکوں کی تعداد ڈیڑھ سو سے بھی کم ہے اور وہ بھی پرانی قسم کے ہیں۔ ہم نے اس بھاری نسبت کو ہر حال میں ختم کرنا ہے۔ زندگی وہی ہے جو اپنے ملک و قوم کی بقا کی خاطر کام آئے۔ میں اور آپ کے پیچھے رہ جانے والے سبھی ساتھی آپ کی کام یابی کے لیے دُعا گو رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اس اہم مشن میں فتح اور کام رانی عطا فرمائے!''

''آمین!'' سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

.....☆.....

چاندنی رات میں وہ آٹھوں تیزی سے اپنے منزل کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے۔ دشمن کے قریب پہنچ کر وہ رُک گئے۔

''جوانو! اب اس مقام سے ہم سب کو مختلف سمتوں میں روانہ ہونا ہے، لیکن چند ہدایات کے ساتھ۔'' ٹینک ہنٹنگ پارٹی کا کمانڈر حوال دار نصیر زمان اپنے جوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے ہوئے بولا۔

''نمبر ایک: آپ سب نے آگے بڑھتے ہوئے آڑ کا خاص خیال رکھنا ہے۔ اسی صورت میں آپ دشمن کے ہوش یار ہونے پر فائرنگ سے خود کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

نمبر دو: فائر کرنے کے لیے آپ کو میرے حکم کا انتظار نہیں کرنا اور نہ ہی خطرے کی شدت کے پیش نظر پیچھے نکلنے کے لیے آپ کو میرے حکم کی ضرورت ہے۔ یہاں تک کوئی شک؟''

سب نے نفی میں سر ہلائے۔

''ٹھیک ہے۔'' حوال دار نصیر زمان دوبارہ بولا۔ ''نمبر تین: قید کا خطرہ محسوس کرتے ہی آپ فوری طور پر اپنے ہتھیار تباہ کر دیں گے۔

نمبر چار: اگر خدانخواستہ آپ قید ہو جاتے ہیں تو اپنا نام، عہدہ اور نمبر کے سوا دشمن کو کچھ بھی نہیں بتانا، خواہ وہ آپ کو موت سے قریب کر دینے والی اذیتیں ہی کیوں نہ دے رہا ہو۔

مجھے امید ہے کہ میری تمام باتیں آپ سب کو سمجھ آ گئی ہوں گی۔''

''جی صاحب!'' سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

''جوانو!'' حوال دار نصیر زمان مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اب ایک دوسرے سے مل لو۔ خدا کو معلوم ہے کہ کون شہید ہو گا اور کون غازی۔''

اس کے بعد سب نے ایک دوسرے سے الوداعی ملاقات کی اور پھر ہاتھ ہلاتے ہوئے مختلف سمتوں میں روانہ ہو گئے۔ انھیں بتایا گیا تھا کہ دشمن نے اگلے مورچوں سے دُور پیچھے مختلف مقامات پر کھڑے گھنے درختوں کے نیچے ٹینکوں کو ''لیگر'' کیا ہے۔

علی جان نہایت محتاط انداز میں تیزی سے ''کرالنگ'' کرتا ہوا دشمن ٹینکوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جب وہ راستے میں آنے والے قبرستان کے قریب سے گزرا تو اُس کے ذہن میں ان بے گناہوں کی لاشوں کا خیال آ گیا جنھیں اس نے تلاشی کے عمل کے دوران میں ایک گھر میں دیکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب وہ بار بار غصے سے دانت پیس رہا تھا۔ قبرستان سے چند فرلانگ آگے آنے کے بعد وہ ایک درخت کے نیچے رُک گیا۔

چند لمحوں بعد وہ آہستہ آہستہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اس وقت مکمل طور پر درخت کی آڑ میں تھا۔ اس کی عقابی نگاہیں تیزی سے اردگرد کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ عین اس لمحے یکے بعد دیگرے دو زوردار دھماکوں نے زمین ہلا کر رکھ دی! ''ٹینک ہنٹنگ پارٹی'' نے شکار کھیلنا شروع کر دیا تھا۔

اچانک علی جان کی نظر ایک بھارتی سنچورئین ٹینک پر پڑی جو اُس سے صرف بیس گز دُور درختوں کے جھنڈ میں چھپا کھڑا تھا۔ اس نے خطرے کی پروا کیے بغیر فوجی تھیلے میں سے ایک راکٹ نکال کر راکٹ لانچر میں فِٹ

کیا اور پھر راکٹ لانچر کو دائیں کندھے پر رکھنے کے بعد ٹینک کو ''گن سائیٹ'' (شِست) میں لے کر راکٹ فائر کر دیا۔ اگلے لمحے دِل دہلا دینے والا دھماکا ہوا اور ٹینک کاغذ کی طرح جلنے لگا۔ عین اسی وقت کہیں دُور یکے بعد دیگرے تین دھماکے سنائی دیے۔ جس کا مطلب تھا کہ جاں بازوں نے ٹینکوں کا اسکور، چھے تک پہنچا دیا ہے۔ اس کے بعد تو گویا قیامت کا آغاز ہوگیا۔ دشمن کی مشین گن پوسٹوں سے اندھا دھند گولیوں کا گویا چھڑکاؤ ہونے لگا۔

چاروں طرف روشنی کے گولے پھٹنے لگے اور اگلے چند منٹ بعد ''پیراشوٹ راؤنڈ'' بھی فائر ہونے لگے۔ روشنی پھیلانے والے یہ گولے کچھ دیر تک فضا میں معلق رہتے تھے اور پھر نیچے گر جاتے تھے۔

''پیراشوٹ راؤنڈ'' کی روشنی میں علی جان کی نظروں نے چار اور ٹینک دیکھ لیے جو دشمن کی ایک مشین گن پوسٹ کے دائیں طرف دس گز کے فاصلے پر واقع درختوں کے نیچے کھڑے تھے۔ وہ انھیں تباہ کرنے کے لیے بے چین ہوگیا، لیکن مشکل یہ تھی کہ دشمن کی اس مقام پر نصب مشین گن لمحہ بہ لمحہ رُخ بدل بدل کر فائر کر رہی تھی۔ علی جان کی ذرا سی غلطی اس کی زندگی کا خاتمہ کر سکتی تھی۔ اس کے پاس اب انتظار کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ کچھ دیر بعد اُس نے درخت کی اوٹ سے مشین گن پوسٹ کی طرف دیکھا۔ مشین گن کا رُخ اب بائیں طرف ہوگیا تھا۔ بس یہی وہ موقع تھا جس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے علی جان نے ''ہینڈ گرنیڈ'' کا پن نکال کر اُسے پوری قوت سے مشین گن پوسٹ کی طرف اچھال دیا۔ دھماکوں کے شور میں اسے کریہہ چیخیں بھی سنائی دیں۔ علی جان کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ ابھر آئی، لیکن اس کے دل میں بھڑکتی انتقام کی آگ ابھی سرد نہیں ہوئی تھی۔ وہ فوراً پیٹ کے بل زمین پر لیٹ گیا۔ اب وہ ''کرالنگ پوزیشن'' میں تیزی سے ان چاروں ٹینکوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ٹینکوں سے تقریباً پندرہ گز دُور پہنچ کر وہ رُک گیا اور قریب ہی کھڑے درخت کی آڑ میں آ گیا۔ اس نے اپنے فوجی تھیلے میں سے راکٹ نکالا اور اُسے راکٹ لانچر میں فٹ کرنے کے بعد ایک ٹینک کو ''گن سائیٹ'' میں لے کر جلدی سے ٹریگر دبا دیا۔ اگلے لمحے ٹینک کے پرخچے اُڑ گئے۔ اس نے نہایت پھُرتی سے دوسرا راکٹ فائر کر کے دوسرے ٹینک کو بھی تباہی کے اندھے

گڑھے میں دھکیل دیا۔ اب دو ٹینک باقی رہ گئے تھے، لیکن علی جان افسردگی کے عالم میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ کاش اس کے پاس دو اور راکٹ ہوتے تو وہ ان دونوں ٹینکوں کا وجود بھی مٹا دیتا!

''پریشان نہ ہو علی جان! میں پہنچ گیا ہوں۔'' اچانک اسے عقب میں آواز سنائی دی۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا تو پارٹی کمانڈر حوال دار نصیر زمان اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

''صاحب! علی جان اپنے کمانڈر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔'' آپ بہت اچھے وقت پر پہنچے ہیں۔ لائیے، دو راکٹ مجھے دیں، تاکہ میں باقی دونوں ٹینکوں کا بھی صفایا کر دوں۔''

''یہ لو۔'' حوال دار نصیر زمان نے اپنے فوجی تھیلے میں سے دو راکٹ نکال کر علی جان کے ہاتھوں میں تھما دیے۔

علی جان نے انتہائی پھرتی سے راکٹ لانچر میں میں راکٹ فِٹ کیا اور تیسرے ٹینک کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تیسرا ٹینک بھی تباہ ہو گیا۔ اس کے بعد علی جان نے چوتھے ٹینک پر راکٹ فائر کیا اور دھماکا ہوتے ہی اس نے خوشی سے نعرہ لگایا: ''نعرۂ ۂ ۂ تکبیر!''

''اللہ اکبر!'' حوال دار نصیر زمان نے بھرپور انداز میں نعرے کا جواب دیا۔

''صاحب! اب اسکور دس تک پہنچ گیا ہے۔'' علی جان کی خوشی دیدنی تھی۔

''علی جان!'' حوال دار نصیر زمان نے اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''ایک ہی رات میں دس ٹینکوں کی تباہی۔ ''بنیا'' آسانی سے اس زخم کو برداشت نہیں کرے گا۔ اس کے سینے پر تو اِس وقت غصے کے مارے سانپ لوٹ رہا ہوگا۔ فائرنگ کی شدت بتا رہی ہے کہ وہ ہم میں سے کسی کو بھی زندہ بچ کر واپس نہیں جانے دے گا، لہٰذا اب ہمیں بہت ہوش یاری کے ساتھ پیچھے نکلنا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے صاحب! آیئے چلیں۔'' علی جان نے فوجی تھیلا اور راکٹ لانچر کندھوں سے لٹکاتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد وہ دونوں چند گز پیدل چلنے کے بعد ''کرالنگ پوزیشن'' میں آ گئے اور تیزی سے پیچھے ہٹنے لگے۔ بھارتی مشین گنوں کی گولیاں چیختی چلّاتی ان کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ دونوں جاں باز رُک رُک کر رینگتے ہوئے تقریباً پانچ سو گز پیچھے آ چکے تھے۔ دشمن نے اچانک مارٹر گنوں کا فائر بھی کھول دیا۔ گولے اب ان دونوں کے آگے پیچھے گر کر پھٹ رہے تھے، لیکن وہ دونوں آگ کے اس سمندر میں راستہ بناتے ہوئے تیزی سے پیچھے ہٹتے جا رہے تھے۔ اچانک ایک گولہ علی جان سے پندرہ گز قدم آگے جاتے حوال دار نصیر زمان سے تقریباً چھے سات گز کے فاصلے پر گر کر زوردار دھماکے سے پھٹا۔ حوال دار نصیر زمان ایک جھٹکے سے دائیں طرف الٹ گیا۔ اس کی خاکی وردی تیزی سے سرخ ہونے لگی۔ مارٹر گولے کے کئی ٹکڑے اس کے وجود میں اُتر گئے تھے۔ اس نے اُٹھنے کی کوشش کی، لیکن دوبارہ زمین پر گر گیا۔ اس دوران میں علی جان تیزی سے ''کرالنگ'' کرتا ہوا اُس تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے اُس کے سینے پر کان رکھ دیے، لیکن حوال دار نصیر زمان کے دل کی دھڑکنیں خاموش تھیں۔ اس شیر دِل جاں باز نے اپنی جان اپنے وطن کی مٹی پر قربان کر دی تھی!

اپنے کمانڈر کو چھوڑ کر جانا علی جان کو کسی صورت گوارا نہ تھا۔ اس نے چند لمحے سوچا اور پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اپنا اور حوال دار نصیر زمان کا فوجی تھیلا ایک کندھے سے لٹکایا، اور دوسرے کندھے سے دونوں راکٹ لانچر لٹکائے، پھر اپنے شہید کمانڈر کو اُٹھا کر اپنے کندھوں پر رکھا اور پوری قوت سے پیچھے کی طرف دوڑنے لگا۔ اچانک مارٹر گن کے دو گولے اس سے دس بارہ گز کے فاصلے پر گر کر پھٹے۔ وہ اپنے شہید کمانڈر سمیت اچھل کر کئی فٹ دُور جا گرا۔ گرتے ہوئے اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے سیسہ اس کی داہنی پنڈلی اور پسلیوں میں اتار دیا ہو۔ اب اس کی خاکی وردی بھی آہستہ آہستہ سرخ ہونے لگی، پر نہ جانے وہ کون سا ایسا جذبہ تھا جس نے اس کے دِل و دماغ سے تکلیف کے احساس کو مِٹا ڈالا تھا۔ اس وقت اس کے ذہن پر بس ایک ہی دُھن سوار تھی کہ کسی طرح اپنے شہید کمانڈر کو لے کر اپنے مورچوں تک پہنچ جائے۔

دشمن نے اب مارٹر گنوں کا فائر روک دیا تھا، لیکن مشین گنوں کی تڑتڑاہٹ ابھی تک جاری تھی۔ روشنی کے گولے اب چاروں طرف فائر کیے جا رہے تھے۔ ان حالات میں علی جان کا اُٹھنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ سوچتے سوچتے اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ وہ آہستہ آہستہ رینگتا ہوا حوال دار نصیر زمان شہید کے پاس پہنچا۔ اسے کروٹ کے بل لٹا کر خود بھی اس کے عقب میں کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ فوجی تھیلے سے رسی نکال کر اُس کے ذریعے اپنے اور اپنے کمانڈر کے جسم کو مضبوطی سے باندھ دیا اور پھر کروٹ بدل کر منہ کے بل لیٹ کر اپنے کمانڈر کو اپنے اوپر لاد لیا اور دونوں فوجی تھیلے ایک کندھے سے اور دونوں راکٹ لانچر دوسرے کندھے پر لٹکا کر جھاڑیوں کی اوٹ میں رہتے ہوئے آہستہ آہستہ ''کرالنگ'' کرتے ہوئے اپنے مورچوں کی طرف بڑھنے لگا۔ بالآخر دو گھنٹوں کی انتھک محنت کے بعد وہ اپنے مورچوں تک پہنچنے میں کام یاب ہو گیا!

''نعرۂ ۂ ۂ تکبیر!''

اسے زندہ سلامت دیکھ کر اُس کے ساتھیوں میں سے ایک نے فلک

شگاف نعرہ لگایا۔

''اللہ اکبر!''

دوسرے ساتھیوں نے نعرے کا بھرپور جواب دیا۔

دو جوانوں نے جلدی جلدی اس کے کندھے سے فوجی تھیلے اور راکٹ لانچر اتارے اور رسّی کو کھول کر دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔

کمپنی کمانڈر اور پلاٹون کمانڈر نعرے کی آواز سُن کر دوڑتے ہوئے ''بنکر'' سے باہر نکل آئے۔

''شاباش، علی جان!'' کمپنی کمانڈر علی جان کو فخریہ انداز میں دیکھتے ہوئے بولے۔ ''واقعی تم ایک شیر دِل جوان ہو۔ مجھے تمھاری جرأت مندی پر فخر ہے!''

''نصیر زمان ٹھیک تو ہے نا!؟'' پلاٹون کمانڈر نے علی جان سے پوچھا۔

''نہیں سر! میرا پارٹی کمانڈر شہید ہو چکا ہے!'' علی جان نے نقاہت بھری آواز میں جواب دیا۔

''اور باقی جوان؟''

''صاحب! ان کا مجھے علم نہیں۔ دشمن نے چار ٹینکوں کے تباہ ہوتے ہی مشین گنوں کا اندھا دھند فائر کھول دیا تھا۔ اس کے بعد ''پیرا شوٹ راؤنڈ'' بھی چلائے گے تھے، جب ہم واپس پیچھے آ رہے تھے تو دشمن نے مارٹر گنوں کا فائر بھی کھول دیا تھا۔ شاید وہ سب شہید ہو گئے ہیں۔ اگر زندہ ہوتے تو یقیناً مجھ سے پہلے آپ تک پہنچ جاتے۔'' علی جان نے کہا اور پھر اُس نے کھڑا ہونے کی کوشش کی تو لڑکھڑا کر گر پڑا۔

''اوہ!'' اس کے منہ سے کاری نکلی۔

''علی جان! تم زخمی ہو؟'' کمپنی کمانڈر نے پوچھا۔

''نہیں صاحب! کوئی خاص زخم نہیں ہیں۔ آپ فکر مند نہ ہوں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' علی جان نے بات بنانے کی کوشش کی۔

''مجھے چکر نہ دو علی جان! میں جانتا ہوں، تم اس وقت شدید زخمی ہو۔'' کمپنی کمانڈر اُسے بغور دیکھتے ہوئے بولے۔ اس کے بعد اُنھوں نے علی جان کے قریب بیٹھ کر اُس کی داہنی پنڈلی کو ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھنا چاہا تو اُن کی انگلیاں گوشت میں دھنستی چلی گئیں۔ وہ لرز اُٹھے۔ انھوں نے علی جان کی قمیص کے نچلے بٹن کھول کر دیکھا تو اُس کی پسلیوں پر نظر پڑتے ہی ان کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ علی جان کی دائیں طرف کی پسلی کی تمام ہڈیاں چکنا چور ہو چکی تھیں۔ انھیں علی جان کی حوصلہ مندی اور قوت ارادی نے حیران کر دیا تھا!

''غازی کمال صاحب!'' کمپنی کمانڈر اپنے دائیں طرف کھڑے پلاٹون کمانڈر کی مخاطب کرتے ہوئے بولے۔ ''علی جان کو فوراً ہسپتال پہنچانے کا بندوبست کیجیے۔ مجھے اس کی حالت سخت خطرے میں دکھائی دے رہی ہے۔''

''بہتر جناب!'' پلاٹون کمانڈر نے کہا اور وہاں سے جانے لگے۔

''نہیں صاحب! اب اس کی ضرورت نہیں۔ میں نے اپنی قوم کے بے گناہوں کا انتقام لے لیا ہے!'' علی جان بولا۔ ''اب میں بہت سکون سے جا سکتا ہوں۔'' علی جان کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔

''بیٹے! وقت ضائع نہ کرو۔ تمھاری جان بھی جا سکتی ہے۔'' کمپنی کمانڈر بولے۔

''صاحب! میں مر کر بھی نہیں مروں گا!'' علی جان نے معنی خیز نظروں سے اپنے کمپنی کمانڈر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''صاحب! میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں مروں گا نہیں!''

اس سے پہلے کہ کمپنی کمانڈر صاحب کچھ کہتے علی جان خاموش ہو گیا۔ ہمیشہ کے لیے، کبھی نہ بولنے کے لیے!''

لیکن اس کے افسر اور سب جوان اس بات کی تہ تک پہنچ گئے تھے۔ علی جان نے سچ ہی تو کہا تھا: ''میں مروں گا نہیں!'' اللہ کی راہ میں جان دینے والے مرا نہیں کرتے، اَمر ہو جاتے ہیں!

علم کا ذوق، عمل کا شوق بڑھانے والا بچوں کا رسالہ

ماہ نامہ

ذوق و شوق

کراچی

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ العالی

کی زیر سرپرستی الحمدللہ گزشتہ ۱۵ برس سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔

اس شمارے میں بچوں/بچیوں کے لیے تعلیم، تربیت اور تفریح سے بھرپور مواد ہوتا ہے، جس کا بچوں/بچیوں کو انتظار رہتا ہے۔

یہ رسالہ بچوں کے ادب میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے اور ملک میں شائع ہونے والے بچوں کے رسالوں میں ایک امتیازی شان کا حامل ہے۔

اگر آپ اپنے بچوں/بچیوں کو فی زمانہ چھوٹی بڑی اسکرین سے بچانے کے لیے کسی متبادل کی تلاش میں ہیں تو ماہ نامہ ذوق وشوق کافی حد تک آپ کی امیدوں پر پورا کرسکتا ہے۔

اس کے لیے آپ اپنے نام، مکمل ڈاک کے پتے اور جس ماہ سے رسالہ جاری کروانا ہے اس ماہ کا نام لکھ کر صرف ہزار (=/1000) روپے جمع کروائیں اور ہر ماہ، ماہ نامہ ذوق وشوق گھر بیٹھے حاصل کریں۔ (شمارے کی قیمت بڑھنے کی صورت میں سالانہ خریداری کی رقم میں اضافہ ہوسکتا ہے۔)

سالانہ خریداری کے لیے تین طریقوں سے آپ رقم جمع کرواسکتے ہیں:

1 منی آرڈر کے ذریعے۔

اس کے لیے ہمارا پتا ہے: ماہ نامہ ذوق وشوق، کراچی، پی۔او۔بکس نمبر: 17984، گلشن اقبال، کراچی۔ پوسٹ کوڈ: 75300

2 بینک اکاؤنٹ کے ذریعے۔

بینک اکاؤنٹ میں رقم جمع کروانے کے لیے ہمارا بینک اکاؤنٹ ہے:

اکاؤنٹ ٹائٹل: Bait ul ilm Trust Zouq o Shouq

اکاؤنٹ نمبر: 0179-0103431456

(نوٹ: بینک اکاؤنٹ میں رقم جمع کروانے کی رسید آپ ہمیں اس نمبر پر (0324-2028753) واٹس ایپ کردیں۔)

3 دستی، یعنی دفتر آکر۔

دفتر میں آکر رقم جمع کروانے کے لیے ہمارا پتا ہے: مدرسہ بیت العلم، ST-9E، نزد الحمد مسجد، گلشن اقبال بلاک 8، کراچی

(نوٹ: دستی رقم جمع کرواتے وقت سالانہ خریداری فارم ضرور پُر کریں۔)

کوپن برائے بلاعنوان ۱۶۹

نام: ____________ ولدیت: ____________

مکمل پتا: ____________

فون نمبر: ____________

کوپن برائے ذوقِ معلومات ۶۸

نام: ____________ ولدیت: ____________

مکمل پتا: ____________

فون نمبر: ____________

سوال آدھا جواب آدھا ۲۴

نام: ____________ ولدیت: ____________

مکمل پتا: ____________

فون نمبر: ____________

کوپن برائے قرآن کوئز ۱۳

نام: ____________ ولدیت: ____________

مکمل پتا: ____________

فون نمبر: ____________

مقابلۂ خوش خطی ۱۲

نام: ____________ ولدیت: ____________

مکمل پتا: ____________

فون نمبر: ____________

ہدایات: جوابات ۳۰ ستمبر ۲۰۲۱ء تک ہمیں موصول ہو جانے چاہییں...... ☆ایک کوپن ایک ہی ساتھی کی طرف سے قبول کیا جائے گا......

☆ کمیٹی کا فیصلہ حتمی ہوگا جس پر اعتراض قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ مقررہ تاریخ کے بعد موصول ہونے والے جوابات قرعہ اندازی میں شامل نہیں کیے جائیں گے۔

پیارے پیارے بچوں کے لیے بیت العلم کی نئی کتابیں

والدین و سرپرست حضرات سے گزارش

بچوں کو کہانیاں سننا اچھا لگتا ہے.... کہانیاں سننے سے ان کی صلاحیتیں بڑھتی ہیں.... بچوں کی کتابوں سے دوستی ہوجاتی ہے اور آداب سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔

والدین اپنے بچوں کو کتاب دوست بنانے کے لیے یہ کتابیں ضرور پڑھ کر سنائیں، کتاب پڑھنے اور سمجھنے میں بچوں کی مدد بھی کریں۔

اب Playstore سے ڈاؤن لوڈ کریں۔

GET IT ON Google Play

maktababaitulilm

بیت العلم

Karachi Ph : 021-32726509
Lahore Ph : 042-37112356
www.mbi.com.pk

سلسلہ

تحفۃ الدعاء

دعا عظیم نعمت اور انمول تحفہ ہے، دعا اللہ تعالیٰ کے قرب اور اس سے راز و نیاز کا ذریعہ ہے، دعا مایوسی میں امید کی کرن ہے، دعا کے ذریعے ہم اللہ تعالیٰ سے اپنے تمام مسائل حل کروا سکتے ہیں، اس دنیا میں کوئی بھی انسان کسی بھی حال میں دعا سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔

اسی فکر کے پیشِ نظر "مکتبہ بیت العلم" نے تحفۃ الدعا سیریز کے نام سے ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! اس سیریز کے چھ حصے شائع ہو چکے ہیں۔

MaktabaBaitulilm

بیت العلم

Karachi Ph : 021-32726509
Lahore Ph : 042-37112356
www.mbi.com.pk